لیکنځی

دریم توک ۸۸ - ۱۹۸۷

نګران او اعزازي مدیر

سید عابد شاه عابد

خورونکی: پښتو اکیډمي کوټه بلوچستان

د معیاري پښتو ادب علامت

"لیکنې"

تازه او غیر مطبوعه نظم او نثر

دریم ټوک ۸۸-۱۹۸۷ء

اعزازي مدیر
سید عابد شاه عابد

مرستیال:-
فاروق سمائلزی
سرور سودائي
سعید گوهر

پښتو اکاډمي کوټه بلوچستان

" لیکنې "

کال ۱۹۸۷ - ۸۸ء

شائع کوونکے...... پښتو اکیډمی کوئټه

د چاپ ځائے....... قلات پریس کوئټه

سرورق......... راز محمد راز یونائیټډ پریس کوئټه

کتابت......... عبدالرحمن "اکوزئ"

بیه......... لس روپئ

فہرست

		مخ
۱۔ آه! ځوانی مرګ ګل خو ستے		۴
۲۔ دوے خبرې		۵
۳۔ پيغام	سينټر فضل آغا	۷
۳۔ پيغام	فضل احمد غازی	۹
۴۔ پښتو ادب	ايوب صابر	۱۱
۵۔ پښتو زبان اور پښتون نسل	ډاکټر خدائے داد	۲۵
۶۔ پښتو زبان و ادب	مقدس خان معصوم	۳۴
۷۔ پښتو ډرامه	سعد الله جان برق	۴۱
۸۔ پښتو ناول نګاری	عبد الکريم بريالے	۴۷
۹۔ امير خسرو	فضل احمد غازی	۶۱
۱۰۔ په شعر کی د فکر يو والے	نذير هنه وال	۷۸

آه،

ځواني مرګ ګل خوستی

پښتو اکېډمي بلوچستان او د لیکنځي اداره د بلوچستان د پښتو ژبې د نوموړي محقق، ادیب او شاعر سید محمد ګل شاه خوستي په ناسا په مرګ خپله غمرازي څرګندوي او دده بې وخته مرګ د پښتو ادب د پاره لوئے تاوان بولي. لوئے خدائے دې په ده باندې رحم اوکړي، په جنت الفردوس کښې دې ځائے ورکړي، او دده پسماندګانو ته دې په دے پیښه کښې د زغم او صبر توفیق ورکړي.

دوې خبرې

۲۶م اګسته کال نولس سوه اوه اتیا ورځ د پښتو اکېډمي د پاره ډېره بختوره ورځ وه، په دې ورځ د پښتو اکېډمي له خوا یوه ورځنۍ سیمنار ترتیب ورکړل سوې وو. په دې سیمنار کښې د پښتو ادب ژبې تاریخ او صحافت په لړ کښې یو شمېر مقالې ولوستل سوې.

هم دغه مقالې نن موږ د کتاب په شکل کښې ستاسو په خدمت کښې د وړاندې کولو موقعه لاس ته کړې ده.

دغه مقالې چې کومو مقاله لیکونکو په سیمنار کښې وړاندې کړې هغه د خپله تعارف محتاجه نه دي بلکه د پښتو نوموړي سیکوال دي، زه او د اکېډمي ټول غړي د هغو منته اداکوو او له دې سره سره د اداره ثقافت بلوچستان هم منته اداکوم چه د دې سیمنار په لړ کښې

یې د پښتو اکیډمي پوره پوره
مرسته کړې ده۔

فقط

عبدالقدوس دراني
جنرل سیکټر پښتو اکیډمي بلوچستان
کوئټه

سینیٹر سید فضل آغا

پیغام

یہ بات میرے لئے خوشی کا باعث ہے کہ گزشتہ چند مہینوں میں آج مجھے دوسری مرتبہ پشتو اکیڈمی کوئٹہ کی تقریب میں شرکت کا موقع مل رہا ہے۔ اس دوران مجھے ایک دو اور ادبی تقریبات میں بھی شرکت کا موقع ملا اور اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاید میرا تعلق بھی ان ہی شاعروں اور ادیبوں سے ہے۔

پشتو اکیڈمی کوئٹہ کے بارے میں میں یہاں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بے سروسامانی میں اس چھوٹے سے ادارے اور اس میں کام کرنے والے رضا کاروں نے اور کارکنوں نے اس علاقے میں پشتو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں تیس چالیس ہزار روپے کی سالانہ گرانٹ میں ایک مناسب دفتر اور دفتر کے اخراجات ادا کرنا اور اس کے ساتھ ہی اشاعتی کام جاری رکھنا کوئی آسان کام نہیں جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے اب تک پشتو اکیڈمی نے بیس بائیس کتابیں چھاپی ہیں لہذا ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اس اکیڈمی کے وسائل میں اضافہ کرنے اور اس کی گرانٹ بڑھانے کے لئے کوشش کریں۔

جہاں تک پشتو زبان و ادب کا تعلق ہے تو جہاں تک میری معلومات ہیں یہ زبان کم از کم پانچ ہزار سال پرانی ہے جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ کوہ بے ستون کے کھنڈرات سے جو قدیم خروشتی خط میں کتبات ملے ہیں ان کی عبارت پشتو ہے اسی طرح دیدوں میں پشتو غاڑوں اور ٹپوں کے وزن پر اشعار پائے جاتے ہیں ان کے علاوہ محققین پشتو زبان کو ہندارو پائی زبانوں میں قدامت کے لحاظ سے سنسکرت کے بعد

دوسری قدیم زبان سمجھتے ھیں لیکن چونکہ اس طرح کی تحقیق ابھی تک جاری ہیں لہذا میں کچھ مزید اس سلسلے میں نہیں کہوں گا البتہ اتنا کہنا چاہوں گا کہ پشتو اس خطے کی ایک قدیم زبان ہے یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے پشتو زبان کے قدیم مخطوطات اور قلمی نسخے اس کا بین ثبوت ھیں اس زبان کے اعزازات میں یہ بات شامل ہے کہ اس شعری سرمائے میں بادشاہوں کے دیوان شامل ھیں اس کے بولنے والے کئی ممالک میں پھیلے ہوئے ھیں اور ان کی تعداد پاکستان میں دوسری زبانوں کے بولنے والے لوگوں سے کئی گناہ زیادہ ہے اس طرح کی تقریبات زبان و ادب کی ترقی اور ترویج میں بہت مفید ہوتی ھیں۔

اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ہم پشتون معاشرت میں پورے معاشرتی اور اخلاقی رویئے کو بھی پشتو کہتے ہیں۔ مثلاً کہ یہ کام کوئی صحیح پشتو نہیں ہے یعنی یہ صحیح نہیں ہے۔ پشتو اخلاقی اقدار اور طرز معاشرت کا نام بھی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اخلاقی اقدار اور اسلامی اخلاقی اقدار سو فیصد ایک دوسرے سے مماثل اور ایک دوسرے کے [illegible] لہذا آپ پشتونوں کی اخلاقیات کو اسلامی اخلاقیات اور اسلامی اخلاقیات کو پشتون اخلاقیات کہہ سکتے ھیں اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پشتون کس قدر اسلامی مزاج اور اسلامی طرز حیات کے قائل اور داعی ھیں لہذا پشتو کی ترویج اور ترقی بالواسطہ طور پر اسلام کی ترقی اور ترقی اور ترویج ہے جو ہمارے ملک کا بنیادی اور قومی نظریہ ہے لہذا اس کے لئے کام کرنا ہمارا فرض ہے۔ میں اس ادبی سیمینار کے لئے نیک خواھشات اور کامیابی کا خواستگار رہوں کیونکہ اس طرح کی تقاریب زبان و ادب کی ترقی اور ترویج کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی ھیں۔

۲۶ اگست ۱۹۸۷ء

پیغام

جناب فضل احمد غازی

پشتو اکیڈمی بلوچستان کے محترم رفیق قابل صد مبارک باد ہیں کہ انھوں نے پشتو کے ممتاز قلم کاروں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا تاکہ وہ قومی زبان اردو میں پشتو ادب کے حسن و رعنائی کا جائزہ لیں چونکہ انسان گزیدگی کے باعث "میں" درویش گزشتہ پچاس دنوں سے ہسپتال میں ہوں ہل جل نہیں سکتا اس لیے اس نعمت سے محروم رہ کر اپنے قلم کار بھائیوں کو سن سکوں اپنی اس محرومیت نے مجھے کافی اذیت دی ہے بہرحال میری دعا ہے کہ میرے اہل قلم ساتھی اس خدمت میں کامیاب و کامران ہوں کہ پاکستان کے ثقافتی گلدستے میں مزید رعنائی اور دلکشی اور عظمت پیدا کریں۔

اس موقع کو غنیمت تصور کرتے ہوئے میں اپنے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کے حوالے سے اپنے قلم کار دوستوں سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک قلم کاروں کا اس سیاسی قیادت کے ساتھ جو وطن کے مجموعی مفادات اور بنیادی نظریے سے مخلص ہر ایک باقاعدہ ربط و ضبط نہ ہو تب تک قلم کار تو کیا خود سیاسی قیادت بھی سالار بے قافلہ اور بے اثر ہے کیونکہ ان دونوں طبقوں کی جد و جہد جب تک مشترک نہ ہو بے اثر ہوا کرتی ہے اس حوالے سے اگر آپ تحریک پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس زمانے کے قلم کار عظیم قائد کی تحریک کے دست و بازو تھے تبھی تو سات سال کے مختصر عرصے میں پاکستان کے قیام کی صورت میں اس صدی کا سب سے بڑا سیاسی معجزہ ظہور میں آیا اور مجھے خوشی ہے کہ پشتو اکیڈمی کے محترم دوست اس راہ پر گامزن ہیں اور ابلاغ عامہ ذرائع میں ایک

تعمیری کردار ادا کر رہے ھیں آج کا یہ محفل جس کے اظہار کا ذریعہ اردو ہے پشتو اکیڈمی کے مخلص دوستوں کے اس جذبے اور خواہش کا مظہر اور ثبوت ہے کہ یہ وطن کے تمام لسانی طبقوں سے اپنے تاریخی تہذیبی اور ثقافتی ربط وضبط کو مزید قوت و توانائی دینا چاہتے ھیں آخر میں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج کے دور میں جبکہ بعض قوتوں نے تخریب کاری، بربریت اور انسان گزیدگی کے عمل کو اپنا لیا ہے قلم کاروں کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوا ہے ۔

مجھے امید ہے کہ میرے قلم کار دوست اس ذمہ داری کو بہ طریق احسن پورا کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ پھر یہ گل زمین وطن اخوت و محبت اور خوشحالی و کامرانی کا گہوارہ بن جائے ۔ اسی میں ہم سب اور ھماری آئندہ نسلوں کی خوشیاں اور بقاء کا راز مضمر ہے اور اس کے برعکس عمل کا دوسرا نام خودکشی ہے یہ برمحل موقع ہے کہ مجھے اپنے وطن اور اپنی قوم کے ساتھ پشتو کا مظاہرہ کریں اور نفرت کے خاتمے کے لئے اپنے قلم کو ہمیشہ کریں ۔ اس سیمینار کے انعقاد کے لئے ادارہ ثقافت بلوچستان نے اپنے تعاون سے ہم سب کو مشکور وممنون کر دیا ہے ۔

خیر اندیش فضل احمد غازی

۲۶ اگست ۱۹۸۷ء

ایوب صابر

پشتو ادب

پشتو ادب کا تذکرہ چھیڑنے سے پہلے اگر مختصر سے الفاظ میں یہ بتا دیا جائے کہ پشتو کیا ہے اور پشتون کون ھیں، تو اس سے ان سامعین اور قارئین کے علم میں ضرور اضافہ ہوگا جو پشتو زبان سے نابلد ھیں اور پشتون قوم سے پوری طرح متعارف نہیں ہوئے یہ تمہید اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایک قوم کی ملی روح سے اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے اور اس تعلق کو سمجھنے کے لئے جہاں اس قوم کے ادب کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے وہاں اُس قوم کی تاریخ اور روایات کو پیش نظر رکھنا بھی لازمی ہے اس کے علاوہ اس سلسلے میں یہ نقطہ بھی نہایت اہم ہے کہ پشتون اپنی ملی روایات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ان سے روگردانی ان کے نزدیک کفر ہے۔

پشتو زبان کا نام ہے، پشتون قوم کا، اور پشتونخوا (سمتِ پشتون) سرحد، ملحقہ قبائل سرحد، بلوچستان، ملحقہ قبائلِ بلوچستان اور اور افغانستان کے ان علاقوں کا جہاں پشتون رہتے ھیں، گویا پشتو، پشتون اور پشتونخوا ایک ہی سلسلے کی تین کڑیاں ھیں اور ان تین کڑیوں سے "پشتونولی" (افغانیت) جیسا معنی دار لفظ بنا ہے جس کا مطلب واضح الفاظ میں ان رسوم و رواج، عادات و خصائل اور روایات کی پابندی ہے جو پشتونوں کو ورثے میں ملی ھیں ان چار کلمات کا لفظی تناسب جو ایک عمیق معنوی اور روحانی ربط کی دلیل ہے دیگر قوموں کی لغات میں کہیں نہیں ملتا۔

پشتو بظاہر زبان کا نام ہے لیکن پشتون اس کا اطلاق عہد و پیمان، عزم و ثبات شجاعت و مردانگی، سخاوت و مہمان نوازی، عفو و درگزر، اولوالعزمی اور ایفائے عہد شرافت و شائستگی اور ایمانداری و طہارت پر بھی کرتے ہیں اور پشتو لغت میں اس لفظ کے یہ تمام معانی درج ہیں پھر اس لفظ سے ان معانی کے قیام کا محل دکھانے کے لئے پشتون صفت مشبہ بناتے ہیں، مثلاً پشتو سے پشتون۔ اسی طرح لفظ "تورہ" (تلوار) کا اطلاق پشتون۔ دلیری، شجاعت، بہادری اور میدان جیتنے پر کرتے ہیں اور ان معانی کے اعتبار سے اس سے صفت مشبہ بناتے ہیں جیسے تور یالی، (شجاع) اور کبھی فارسی کے رنگ میں "تورہ" (تلوار) سے "تورزن" (شمشیر زن) بناتے ہیں اور انہی معانی کے پیش نظر "تورہ" (تلوار) سے "تورہ کول" (میدان مارنا، بہادری دکھانا، معرکے سر کرنا) مصدر اور اس مصدر سے افعال بناتے ہیں۔

پشتون اس قوم کا نام ہے جو دریائے آمو سے "اباسین" (دریاؤں کا باپ یعنی دریائے سندھ) کے ساحل تک اور کشمیر سے بلوچستان اور سیستان کے ریگستانوں اور بحرِ ہند تک اونچے اور دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان آباد ہے۔

کہنے تو ہر وہ شخص پشتون ہے، جو پشتونوں کے علاقوں میں آباد ہے اور پشتو بولتا ہے مگر صحیح معنوں میں پشتون اس کو سمجھا جاتا ہے جو شمشیر زن ہو میدان جنگ میں دشمن کو کبھی پیٹھ نہ دکھائے۔ بڑی بے جگری سے لڑے اور یا تو فتح یا اپنے مسلک پر اپنا سر قربان کر دے۔

ایک سچے پشتون کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی موت بستر پہ واقع نہ ہو۔ بلکہ وہ میدانِ جنگ میں کام آئے، اس کو غسل دینے کی ضرورت پیش نہ آئے اور اس کو لٹھے کے سفید اور بے داغ کفن کی بجائے اسی لباس میں دفنا دیا جائے جو خود اس کے خون سے گلنار ہو۔

پشتون "تورہ" (تلوار، شجاعت) کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور شمشیر زنی کی

صفت ان کی خمیر میں ایسی جزب ہے کہ اگر کسی پشتون کو اس صفت سے محروم کر دیا جائے تو وہ اپنی نگاہوں سے گر جاتا ہے اور اپنے آپ کو پشتون نہیں سمجھتا۔

پشتونوں کا نامور سردار خوشحال خان خٹک پشتونوں کی اسی خو پر مرتا ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے کہ ؎

چه څرګنده سر بازي کاندي د تورو
زه خوشحال خټک تر دامي هُنر جار شم

(میں خوشحال خان خٹک اس ہُنر کے قربان جاؤں جو میدانِ جنگ میں سروں کی بازی لگاتا ہے) بلکہ وہ تو پشتونوں کی تمام مشکلات کا یہی ایک حل بتاتا ہے کہ ؎

پښتانه چه نور څه فکر کا نابود دي
بې د توري خلاصي نشته په بل کار

(اگر پشتون کسی اور فکر میں مبتلا ہیں تو ان کو نیست و نابود سمجھو کیونکہ تلوار کے بغیر نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔)

اپنے بارے میں خود پشتونوں کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ پشتون کو قدرت صرف اس لئے پیدا کرتی ہے کہ وہ میدان جنگ میں شمشیر زنی کے جوہر دکھاتے ہوئے شہید ہو اور اسی عقیدے سے پشتو کی یہ ضرب المثل اخذ کی گئی ہے کہ

نر بسه د حلالولو د پاره وي
(بکرا ذبح کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے)

اس ضمن میں اردو کی ضرب المثل یہ ہے کہ

بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی

شجاعت اور مردانگی کے بارے میں پشتون عورت بھی مردوں سے کم نہیں اور اس کا اندازہ پشتو کے مندرجہ ذیل ٹپوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ

په تور ټوپک ویشتلے راشې
د بے ننګئ احوال دِ مه راځه مینه

(اے میرے محبوب! گھر یوں لوٹو کہ تمہارا سینہ کالی بندوق کی گولیوں سے چھلنی ہو، مگر مجھ تک تمہاری بے حمیتی کا احوال نہ پہنچے۔)

یار مې له توروا پرشا شو
په بیګانئ ورکړے خُله پښیمانه یمه

(میرا محبوب میدان جنگ سے پسپا ہو گیا ہے اور میں اس بوسے پر پشیمان ہوں جو میں نے اس کو گزشتہ رات کو دیا تھا)

تر تور یالی مین به جار شم
چه د غلیم په وینو سره کا نذی لاسونه

(میں اپنے شمشیر زن محبوب پر قربان ہو جاؤں گی، اگر وہ اپنے دشمن کے خون سے ہاتھ رنگ سکا)

جانان مې سر په وطن کیښود
په تار د زلفو به کفن ورله ګنډمه

(میرے محبوب نے وطن پر سر قربان کر دیا ہے اس کا کفن میں اپنی زلفوں کے تار سے سیوں گی)

جانانه جنګ نه په شا نه شې
چه د همزولو را له نه شي پیغورونه

(اے میرے محبوب! میدان جنگ سے پیچھے نہ ہٹنا کہ مجھے اپنی سہیلیوں کے طعنے نہ سننے پڑ جائیں)

پشتو ٹپوں میں اس قسم کے خیالات کی فراوانی ہے اور ان کے مکمل بیان کے لئے دفتر چاہیے۔ اوپر جو ٹپے پیش کئے گئے ہیں وہ "مشتے نمونہ از خروارے"

ھیں اور ان سے پشتون عورت کی ھمت بخوبی واضح ہوتی ہے۔

پشتون انتقام لینے، معاف کرنے اور پناہ دینے میں بھی اپنی مثال آپ ھیں، ایسی مثالیں پشتون معاشرے میں عام ھیں کہ ایک باپ نے لاعلمی میں اپنے بیٹے کے قاتل کو پناہ دی اور حقیقت معلوم ہونے کے بعد بھی اس کی حفاظت کے فرض سے غافل نہ رہا۔ پشتونوں کے انتقام لینے کی خو کا تذکرہ خوشحال خان خٹک نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے کہ ؎

چہ واخلی لہ غلیمہ انتقام
مرد نہ خوب کا نہ خوارہ کہ نہ آرام

(جب تک اپنے دشمن سے انتقام نہ لے لے، مرد نہ سوتا ہے، نہ کھاتا ہے نہ آرام کرتا ہے)

ایک زمانہ تھا کہ پشتون معاشرے میں تلوار کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ آجکل تلوار کی جگہ بندوق نے لے لی ہے اور اب پشتون بندوق کی گولی سے بات کرتے ھیں اور ان کی اس خو سے متاثر ہو کر پشتون خواتین نے ان کے بارے میں یہ ضرب المثل گھڑی ہے کہ:

"منبحی پہ کانہ نہ ستڑی کیږی او نارینہ پہ وسلہ"

(عورتیں زیورات کا اور مرد اسلحہ کا بوجھ اٹھاتے ہوئے نہیں تھکتے)

ھر پشتون ایک مانا ہوا نشانہ باز ہوتا ہے مگر ھر پشتون ایک اچھا سپاہی اس لئے نہیں ہوتا کہ ہر پیشہ ور سپاہی کے لئے اطاعت گزار ہونا لازمی ہے جبکہ پشتون فطرتاً سرکش واقع ہوئے ھیں۔ انہیں اپنی آزادی اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے اور وہ اطاعت اور فرمانبرداری کو اپنی انا کی تذلیل سمجھتے ھیں۔

پشتونوں کی سخاوت اور مہمانوازی کا اندازہ اس رسم سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو سرحد کے قبائلی علاقوں میں آج بھی رائج ہے اور جس کے تحت جب

مہمانوں کے سامنے دستر خوان بچھا دیا جاتا ہے تو کھانے شروع کرنے سے پہلے میزبان اپنے مہمانوں کے سامنے قسم کھاتا ہے کہ جو کچھ میں نے دستر خوان پر پیش کیا ہے اگر اس سے اچھا مجھے میسر ہوا اور میں نے پیش نہ کیا ہو تو خدا مجھے دنیا میں بھی شرمسار کرے اور آخرت میں بھی۔

پشتونوں نے لودھیوں اور سوریوں کی صورت میں ہندوستان پر حکومت کی ہندوستان کی تہذیب پر اثرات چھوڑے اور مسلمانوں کی قوت میں اضافہ کیا محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک ہندوستان پر جس نے بھی حملہ کیا اس کے لشکر میں زیادہ تعداد پشتونوں ہی کی ہوتی تھی پھر احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں لاکھوں مرہٹوں کو شکست دے کر موجودہ پاکستان کے علاقہ کو غیر مسلموں کے غلبے سے پاکستان کے قیام کے لئے محفوظ کیا۔

اس تمہید کو میں فارسی کی یہ ضرب المثل پیش کر کے ختم کرتا ہوں کہ

"فارسی زبان بزم است و پشتو زبانِ رزم"

اب آئیے پشتو ادب کی طرف۔ پشتو بولنے والی قوم کو افغان، پشتون، پختون اور پٹھان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، افغانستان کی ریاست کے قیام کے بعد اگرچہ سیاسی طور پر افغانوں کا نام افغانستان کے باشندوں کے لئے مخصوص ہو گیا ہے لیکن پشتو کے قدیم و جدید ادب میں یہ نام اب بھی اس قوم کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے پشتون، پختون اور پٹھان کہا جاتا ہے۔ جدید نسل کے ماہرین لسانیات ان چاروں ناموں کو مختلف لسانی مشتقات کے ذریعے ایک ہی مفہوم دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں ان کے خیال میں ان چاروں ناموں سے ایک ہی مفہوم ابھرتا ہے اور وہ یہ کہ ان الفاظ کا اطلاق اس قوم پر کیا جاتا ہے جو آریائی ترک وطن کے بعد اپنے ہی علاقوں میں بستے رہے۔ پشتو علماء کا جو گروہ اس قوم کو اسرائیلی خیال کرتا ہے ان کے مطابق افغان بنی اسرائیل کے بن یامینی قبیلے کی شاخ سے ہیں جن کے

مورث اعلیٰ کا نام افغان تھا پہلے نظریئے کے دعویدار میکسملر اور اس کے بعد کے محققین لسانیات کی لسانی تقسیم کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ھیں جبکہ دوسرے نظریئے کے حامی پختون مورخین اور قدیم روایات سے استنباط کرتے ھیں کچھ یہی حال پشتو زبان کی قدامت سے متعلق بھی انہی متضاد نظریات کے نتیجے ہی میں ہوتا ہے۔

پشتونوں کو آریائی قوم سمجھنے والے حضرات ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور نئے دریافت شدہ سنگی کتبوں کے حوالے سے اس زبان کو ماقبل مسیح کے زمانے تک پہنچاتے ھیں جبکہ پختونوں کے اپنے مورخین کے تتبع میں دوسرا گروہ اسے چھٹی صدی عیسوی تک پہنچانے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اگر اس زمانے میں پشتو ایک بولی جانے والی زبان کی حیثیت سے رائج تھی تو اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ زبان ایک نہایت ہی قدیم زبان ہے۔

آریائی نظریئے کے متفقین دار یوش کبیر کے بعض فرامین کو پشتو تسلیم کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے بعض کتبوں کو ڈی سائفر کر کے ان سے پشتو کے تین مصرعے یا جملے دریافت کر لئے ہیں جو یہ ھیں۔

"دار یوش باچا وائی

نہ زہ ورکہ وم

نہ اریکہ وم

نہ دروغ جن وم"

(دار یوش بادشاہ کہتا ہے۔ کہ نہ میں ظالم تھا نہ جابر اور نہ ہی میں دھوکے باز تھا)

اس کے برعکس دوسرا گروہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بیان کرتا ہے کہ آپؐ نے حضرت خالدؓ جیسے یہ گروہ افاغنہ میں سے

سمجھتا ہے) کو مخاطب کرکے فرمایا تھا۔

"خالده! غشے لینده راو اخله الخ"

(خالد! تیر کمان لے آؤ الخ)

ان متصادم نظریات کے باوجود دونوں گروہ اس قدیم زبان کا قدیم ادب ابھی تک دریافت نہیں کر سکے۔ آریائی مکتب کے حامی ایک ایسے تذکرے پر بھی ایمان لاتے ہیں جس کے مطابق پہلا پشتو شاعر ۱۳۹ھ میں گزرا۔ اس کا نام امیر کروڑ تھا۔ لیکن بعض حضرات اس قدیم تذکرے کو بھی من گھڑت اور جعلی سمجھتے ہیں اور اگر یہ واقعی جعلی ہے تو اب تک پشتو ادب کے حوالے سے مختلف محققین نے اردو اور انگریزی میں جو تحقیقی کام کیا ہے وہ سب باطل ٹھہرتا ہے۔

مناسب ہے کہ بات کو ذرا اور واضح کر دیا جائے افغانستان کے مشہور محقق آغائے عبدالحیٔ حبیبیؔ نے ایک کتاب دریافت کی تھی جس کا نام "پٹہ خزانہ" (پوشیدہ خزانہ) ہے۔ عبدالحیٔ حبیبیؔ نے کتاب کے مرتب کا نام "ملا ہوتک" بتایا ہے عبدالحیٔ حبیبیؔ کا انتقال پچھلے برس کابل میں ہوا تھا۔ اور ان کی زندگی میں ہی پشتو کے مشہور شاعر، ادیب، نقاد اور محقق صاحبزادہ حبیب الرحمان قلندر مومند نے "پٹہ خزانہ" کو ایک من گھڑت اور جعلی تذکرہ کہہ دیا تھا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک مدلل مقالہ بھی لکھا تھا جو پشتو اکیڈیمی پشاور کے مجلہ "پشتو" میں چھپا اور اس پر ایک لامتناہی بحث چھڑ گئی۔ کسی لکھنے والے نے عبدالحیٔ حبیبیؔ کی طرفداری کی کسی نے قلندر مومند کو برحق قرار دیا۔ امیر حمزہ شنواری نے کہا کہ اگر قلندر مومند کا چیلنج صحیح ہے، تو "پٹہ خزانہ" کو دریا برد کرنا پڑیگا تب ہمارے پاس پشتو ادب کی جو تاریخ رہ جائے گی، وہ صرف چار سو سال پرانی ہوگی جبکہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ پشتون چار پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ

پرانی قوم ہے۔ امیر حمزہ شنواری نے یہ بھی سوال اٹھایا کہ پشتون وحشی اور جاہل تھے کہ ان کی تاریخ تو پانچ ہزار سال سے بھی پرانی ہے جبکہ ان کا ادب صرف چار سو سال پرانا ہے۔

امیر حمزہ شنواری کے جواب میں قلندر مومند یہ وضاحت پیش کرتے ہیں کہ جس طرح انگریزی ایک قدیم زبان ہے مگر اس کی معلوم ادبی تاریخ صرف چھ سو سال پرانی ہے اسی طرح پشتو بھی ایک قدیم زبان ہے مگر اس کی معلوم ادبی تاریخ صرف چار سو سال پرانی ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ "پٹہ خزانہ" کو قلندر مومند نے عبدالحئی حبیبیؔ کی زندگی میں ہی ایک من گھڑت اور جعلی کتاب قرار دیا تھا اور آغائے عبدالحئی حبیبیؔ نے اس پر خاموشی اختیار کر لی تھی بہرحال پٹہ خزانہ ایک جعلی کتاب ہے یا سچی کتاب ہے یہ فیصلہ ابھی نہیں ہوا۔

بدقسمتی سے پشتو ادب کے لوک ورثے کو اچھے محافظ نہیں مل سکے یہی وجہ ہے کہ لوک گیتوں اور لوک رقص سے بھی زمانے اور وقت کا تعین کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ضرب المثل سے کھینچ تان کر یہ مفہوم نکالا جا سکتا ہے کہ کم از کم یہ ضرب المثل افغانوں میں اسلام پھیلنے سے قبل موجود تھی۔ یہ کہاوت ایک خاتون کے بارے میں ہے جس نے کہا تھا کہ

"ہمارے زمانے میں نہ تو خدا تھا اور نہ ہی رسول بلکہ ایک سالار تھا اور ایک منصور"

لیکن یہ استنباط بھی صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اس خیال کو خاتون کی جہالت پر محمول نہ کرتے ہوئے اسے ایک حقیقت فرض کیا جائے۔ اس تمام بحث کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ زمان و مکان کے تعین کے بغیر بھی پشتو میں نظم و نثر کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے جس کی موجودگی میں اسے ایک تہی دامن اور بے مایہ زبان نہیں کہا جا سکتا۔

دنیا کی دوسری زبانوں کے برعکس پشتو میں ادب کی ابتداء نثر سے ہوتی ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ پشتو کی پہلی کتاب جس کے بارے میں کوئی بھی اختلاف نہیں، نثر میں ہے۔ اس کتاب کا نام خیر البیان ہے اور اس کے مصنف بایزید انصاری ہیں جو مغل شہنشاہ اکبر کے ہمعصر تھے اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے مصنف اسے "من جانب اللہ" سمجھتے ہیں اور دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ پشتو کے حروف تہجی ان کو الہاماً بتائے گئے ہیں۔ اس سے اگر اور کچھ نہیں تو یہ نتیجہ تو نکالا جا سکتا ہے کہ بایزید انصاری سے پہلے پشتو کا رسم الخط کم از کم موجودہ حالت میں مفقود تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پشتو کا موجودہ رسم الخط اسی رسم الخط کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جسے بایزید انصاری نے ایجاد کیا تھا۔ بایزید انصاری اور اس کے خاندان نے پشتو کو صرف رسم الخط ہی نہیں دیا بلکہ انہی سے پشتو کی باقاعدہ شاعری کی بھی ابتداء ہوتی ہے ارزانی، مخلص، مرزا خان انصاری اور دولت لوہانی کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ ان میں مرزا خان انصاری کی شاعرانہ عظمت کو خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا نے بھی تسلیم کیا ہے انصاری مکتب کے شعراء کا موضوع تصوف ہے یہ تمام شعراء وحدت الوجود پر ایمان رکھتے تھے اور انہوں نے جس طرح غزل میں اس نظریے کو سمویا اس کی نظیر پشتو ہی میں نہیں بلکہ دوسری ہمسایہ زبانوں میں بھی نہیں ملتی نعت گوئی میں بھی اولیت کا سہرا اسی خانوادے کے سر ہے۔

اس خانوادے کے آخری بڑے شاعر دولت لوہانی کو خوشحال خان خٹک نے اپنا ہمعصر کہا ہے گویا خوشحال خان خٹک نے انہی فنی روایات کو آگے بڑھایا ہے جو اس خاندان کی بنا کردہ تھیں خوشحال خان خٹک محتاج تعارف نہیں انہوں نے نہ صرف پشتو شاعری کی روایات کو قائم رکھا بلکہ ان کی وجہ سے پشتو ادب کی باقاعدہ تاریخ بھی شروع ہوئی ان کے فرزندوں اور پوتوں نے نظم و نثر

میں بہت بڑا اضافہ کیا۔ خود خوشحال خان خٹک نے بھی نثر میں ایک نئی طرز کی بنیاد ڈالی ان سے قبل جیسا کہ عرض کیا گیا ہے خیر البیان نثر میں لکھی گئی اور خیر البیان کے جواب میں اخون درویزہ کی کتاب "مخزن" بھی نثر میں ہے لیکن ان دونوں کتابوں اور خوشحال خان خٹک کی نثر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خوشحال بابا کے پیشروؤں کی نثر مسجعات اور تکلف سے لبریز ہے۔ جبکہ خوشحال بابا کی نثر سادگی برجستگی اور سلاست سے مالامال ہے اور اگرچہ خوشحال بابا کے جانشینوں نے ان کے اسلوب کو نہیں اپنایا لیکن درحقیقت پشتو کی جدید نثر کی ابتداء خوشحال بابا سے ہی ہوتی ہے خوشحال بابا کو اس لحاظ سے بھی پشتو ادب میں خصوصیت حاصل ہے کہ ان کے بعد ادبی کاروان کا سلسلہ ٹوٹا نہیں بلکہ یہ قافلہ وہیں سے شروع ہو کر ابھی تک سرگرم سفر ہے۔

خوشحال خان خٹک کے بعد ان کے اپنے خاندان میں اشرف خان ھجریؔ، عبدالقادر خٹک، سکندر خان خٹک اور صدر خان خٹک جوان کے بیٹے تھے پشتو غزل گوئی میں ایک خاص مقام رکھتے ھیں ان کے پوتوں اور پڑپوتوں میں افضل خان خٹک، کامگار خان خٹک اور کاظم خان شیدا اچھے نثر نگار اور غزل گو تھے خوشحال خان خٹک کے خاندان سے باہر جن اساتذہ نے پشتو کو سنوارا، ان میں رحمان بابا، اور حمید مومند خاص طور پر قابل ذکر ھیں۔

اس دور میں پشتو کے یہی تین شاعر ھیں جن کی تقلید میں پشتو ادب تین واضح سکولوں میں بٹ گیا علی خان، مصری خان گگیانی، حسین، محمدی صاحبزادہ کا تعلق رحمان بابا اور حمید مومند کے مکاتیب سے ہے جبکہ خوشحال خان خٹک کے مکتب کو انیسویں صدی میں پھر عروج حاصل ہوا اور پشتو کی جدید شاعری خوشحال خان بابا کے مکتب ہی کا احیا ہے۔ ان دو صدیوں میں بے شمار شاعر گزرے ہوں گے لیکن ان کا کلام منظر عام پر نہیں آسکا اولاً تو اس لئے کہ اس زمانے میں طباعت کی صنعت موجود نہیں تھی اور ثانیاً اس لئے کہ ان

دو صدیوں میں سیاسی صورت حال انتہائی مخدوش تھی، سکھوں اور انگریزوں نے اس علاقے میں صرف سیاسی غلبہ ہی حاصل نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے اور خاص طور پر انگریزوں نے پختونوں کا کلچری اور ادبی سرمایہ بھی لوٹا یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے شاعروں کے مجموعوں کے قلمی نسخے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں تو پائے جاتے ہیں لیکن یہاں ان کے نام تک سے کوئی واقف نہیں، سکھوں کے غلبے کے زمانے میں چار بیتوں کی بہتات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چونکہ چار بیتے عام طور پر گائے جاتے ہیں، اس لئے ان کو قید تحریر میں لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور یہ چار بیتے یوں سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتے رہے انگریزوں کے دور میں صرف چھاپے خانے ہی نہیں آئے بلکہ سیاسی آزادی کے حصول کے لئے منظم تحریکیں بھی شروع ہوئیں ان تحریکوں میں پشتون شعراء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ ایک لمبے عرصے تک ان تحریکوں کی عملی قیادت بھی شعراء اور دانشوروں نے کی ان دانشوروں میں صنوبر حسین مومند، محمد اکبر خادم، عبدالاکبر خان اکبر، میاں احمد شاہ، ماسٹر عبدالکریم اور غنی خان سر فہرست ہیں، اسی دور میں چھاپے خانوں کی وجہ سے دوسری زبانوں کے ادب اور شاعری سے بھی واقفیت کا آغاز ہوا، پشتو میں توبۃ النصوح اور مراۃ العروس کے علاوہ انگریزی مسیحی ادب کے ترجمے بھی ہوئے، کالجوں کے قیام سے اس علاقے میں عالمگیر زبانوں کے شہ پاروں سے بھی تعلیم یافتہ طبقے کا تعارف ہوا اور اس طرح معیار اور مقدار کے لحاظ سے پشتو ادب میں کافی اضافہ ہوا اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تعلیم کے فروغ کی وجہ سے پشتو میں ڈراموں کا رواج پڑا اور ڈراموں کی ابتداء تو سیاسی کھیلوں سے ہوئی لیکن بعد میں سماجی اور نفسیاتی موضوعات پر بھی ڈرامے لکھے گئے ان ابتدائی ڈرامہ نگاروں میں عبدالاکبر خان اکبر، عبدالخالق خلیق، فضلِ حق شیدا، میاں سید رسول رسا اور ایس اے رحمان شامل تھے۔

قیام پاکستان کے بعد پشتو میں پہلی مرتبہ منظم ادبی تحریکیں شروع ہوئیں، اولسی

ادبی جرگہ نے ادبی تاریخ میں پہلی بار تنقید کو رواج دیا اس ادبی تنظیم کے باقاعدہ ہفتہ وار تنقیدی اجلاس منعقد ہوا کرتے تھے اور ان تنقیدی جلسوں کے نتیجے میں جس صنف ادب کو نمایاں ترقی ہوئی وہ افسانہ تھی، افسانے کے ساتھ ساتھ اولسی ادبی جرگہ نے تنقید کا آغاز بھی کیا۔

اولسی ادبی جرگہ مختلف الخیال شاعروں اور ادیبوں کی ایک ادبی تنظیم تھی ان میں کمیونسٹ، پشتون قوم پرست، اسلام پسند وغیرہ سب شامل تھے۔ جب تک صنوبر حسین مومند زندہ رہے، یہ تمام مختلف الخیال شاعر اور ادیب مل کر کام کرتے رہے، صنوبر حسین مومند کے انتقال کے بعد جرگہ انتشار کا شکار ہو گیا اور بالآخر ٹوٹ گیا، تب قلندر مومند اور ان کے ہم خیال دوستوں نے ایک نئی ادبی تنظیم "دسا ہو لیکو نکو مرکہ" (منتخب لکھنے والوں کی فیڈریشن) کی بنیاد رکھی۔ یہ دراصل "اولسی ادبی جرگہ" کا احیاء تھا۔ مرکہ کے پہلے سیکرٹری جنرل قلندر مومند منتخب ہوئے ایک سال کے بعد اس عہدے کے لئے راقم الحروف کا انتخاب عمل میں آیا راقم الحروف کے بعد سعد اللہ جان برق، سلیم راز، اور سید محمود ظفر یکے بعد دیگرے مرکہ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے، اور ان میں سے بھی جو غیر فعال ہو جاتا تو بوجھ قلندر مومند اور راقم الحروف پر آپڑتا۔ آجکل مرکہ کے سیکرٹری جنرل قلندر مومند ہیں اور اس کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہو رہے ہیں۔

اولسی ادبی جرگہ اور دسا ہو لیکو نکو مرکہ نے پشتو ادب میں وہی کردار ادا کیا جو اردو ادب میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے ادا کیا۔

بلوچستان کی تمام ادبی تحریکوں کا مجھے علم نہیں لیکن اس کی ایک تنظیم "ادبی ملگری (ادبی دوست)" سے میرا ربط رہا ہے جس کے اراکین میں رب نواز مائل، سعید گوھر، سرور سودائی سید خیر محمد عارف، عبد الکریم بریالے، عبید اللہ درویش درانی اور عمر گل عسکر شامل ہیں بلوچستان کی اس ادبی تنظیم نے پشتو ادب میں وہی کردار ادا کیا جو اردو ادب میں حلقہ ارباب ذوق نے ادا کیا ہے۔

جدید پشتو ادب کا تذکرہ ابھی باقی ہے اس عنوان کے تحت میری ایک کتاب جرمن ۱۹۷۴ء میں چھپی تھی۔ جو اس وقت بھی نامکمل تھی۔ میرا ارادہ ہے کہ اپنی کتاب پر مزید کام کروں اور اس کو موجودہ دور تک پھیلا دوں مگر اس موضوع پر کام کرنے کی گنجائش ہر دور میں موجود رہے گی کہ پشتو ادب پھیلتا چلا جارہا ہے۔ اور نئی نسل اس میں برابر اضافے کر رہی ہے مختصر سے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت پشتو ادب ان تمام اصناف سے مالا مال ہے جو ایک ترقی یافتہ زبان میں موجود رہنی چاہئیں اور تو اور ایک شاعر تو ایسا بھی ہے جس نے نثری نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس کی نثری نظموں نے اُن بزرگوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے جو اب تک آزاد نظم کو بھی قبول نہیں کر پائے۔

پشتو ادب میں آج ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنز و مزاح، سفرنامہ، رپورتاژ تنقید اور تحقیق سب کچھ موجود ہے خصوصاً انشائیہ تو پشتو میں اردو سے بھی بہت پہلے لکھا گیا تھا۔ اور احمد شاہ، عبدالخالق خلیق، مولانا عبدالقادر اور دوست محمد خان کامل نے بھی انشائیے لکھے تھے۔ اور انھوں نے انشائیہ کو تکل کا نام دیا تھا۔

پشتو ادب ایک وسیع موضوع ہے اس میں قدیم پشتو ادب کے علاوہ جدید پشتو ادب بھی آتا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں مکمل قدیم ادب کو بھی اس مضمون میں سمو نہیں سکا۔ چہ جائیکہ مکمل جدید ادب کو بھی پیش کرتا جو کچھ میں نے اس مضمون میں پیش کیا ہے اس کی حیثیت ایک تعارف سے زیادہ نہیں ایک تو وقت کم تھا۔ دوسرا مجھے آج کی محفل کے سامعین پر بھی رحم آگیا تھا۔ سو میں نے اس مضمون کو زیادہ پھیلانے سے گریز کیا۔ مناسب یہی ہے کہ جدید پشتو ادب کے تذکرے کو میں ایسے ہی کسی اور سیمینار کے لئے چھوڑ دوں اب بھی میں نے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی وقت لے لیا ہے جس کے لئے میں آپ سب سے معذرت خواہ ہوں۔

پشتو زبان اور پشتون نسل

ڈاکٹر خدائے داد

خواتین وحضرات!

سب سے پہلے تو میں پشتو اکیڈمی کوئٹہ کے تمام اراکین کا دل کی گہرائیوں سے شکرانہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ اس اکیڈمی کے کارکن نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے فراخدلی سے کام لیکر مجھے اس شاندار اجتماع میں شرکت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ایسے ایک علمی اجتماع میں حصہ لینے کے لئے مجھے اپنی کم علمی کا بھی احساس ہے مگر چونکہ ایک کام سپرد ہو چکا ہے اس لئے ایک عالمانہ قسم کا مقالہ پیش نہ کرسکنے کی بات سے گھبرا جانا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ میرے لئے جس موضوع کا انتخاب ہوا ہے وہ مشکل ضرور ہے مگر یہ میری اپنی زبان کا مسئلہ ہے اور اپنی زبان کے بارے میں زیادہ علمی نہ سہی کچھ نہ کچھ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ پشتو زبان اگرچہ زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے مگر موجودہ پُرآشوب دور میں اس زبان کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ پشتو زبان آریہ زبانوں کے گچھے میں ایک بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ ہزاروں سالوں سے زمین کے جس خطے میں یہ زبان بولی جاتی ہے آج وہ خطہ بھی مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ پشتو زبان بولنے والے بہت کم لوگ اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ تاریخ کی ایک عجیب وغریب ستم ظریفی ہے کہ قدیم زمانے سے ہی پشتو زبان بولنے والی نسل نے اپنی زبان کو تحریر میں لانے اور اس کو دوسری زبانوں کی طرح علمی زبان بنانے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ اس کے وجوہات کیا ہیں۔ یہ اپنے طور

پر ایک الگ موضوع ہے جو تحقیق طلب بھی ہے اور قابل توجہ بھی۔

پشتو زبان کی سب سے پرانی تحریر جو پتھر پر کندہ کی ہوئی ملی ہے اس کے بارے میں کینٹ کی تصنیف اولڈ پرشین کے حوالے سے مرحوم عبدالحئی حبیبیؔ اپنی تصنیف پشتو ادبیات کی تاریخ لکھتے ہیں۔ کہ داریوش اعظم ایران کی ہخامنشی خاندان کا ایک مشہور بادشاہ ہے جس نے ۵۲۲ ق م سے ۴۸۶ ق م تک حکومت کی ہے اس کے حکم سے ببستون کے پہاڑ پر ایک پتھر پہ ایک تحریر کندہ کی ہوئی ہے جو اس طرح ہے۔ داریوش بادشاہ کہتا ہے۔ اُرمز دا اور دوسرے دیوتاؤں نے میری مدد اس لئے کی کہ میں نہ تو الجھن میں ڈالنے والا ہوں نہ جھوٹا ہوں۔ نہ ظالم ہوں اور نہ ہی میرے خاندان نے سچ کا دامن چھوڑا ہے۔ یہ تحریر اس دور کے مروج جس رسم الخط میں لکھی گئی ہے اسکو پڑھ لینے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا ہر لفظ پشتو ہے۔ اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ قدیم ایران یا پارس کے اس مشرقی حصے، موجودہ افغانستان میں داریوش اعظم کے فرمان کا پشتو ترجمہ اس لئے تحریر کیا گیا تھا کہ اس علاقے کے لوگ اپنی زبان پشتو میں اس کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

پشتو زبان بولنے والے یہ لوگ جو پشتون افغان اور پٹھان کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں قدیم زمانے سے لیکر اب تک تاریخ کے ہر دور میں ایک نہایت اہم مقام پہ نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ نہایت معنی خیز انداز میں فرماتے ہیں۔

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملت افغان در آن پیکر دل است
در فسادِ او فسادِ آسیا
در کشادِ او کشادِ آسیا

ایشیا کے آب و گل کے پیکر میں دل کی حیثیت رکھنے والی نسل ملت افغان جہالت

اور پسماندگی کے اندھیروں میں ابتدا سے لیکر اب تک انسانی اقدار کی تبدیلیوں سے بے خبر نظر آتی ہے اپنا ایک نمایاں اور مخصوص نسلی نام اور زبان رکھتے ہوئے بھی وہ اپنی نسلی بنیاد کے بارے میں شکوک وشبہات سے دوچار ہے۔

پشتونوں کی نسلی بنیاد کے بارے میں زیادہ تر تحقیقات روایتوں کے حوالے سے کی گئی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹیانیکا کے ۱۹۶۸ء سے پہلے کے ایڈیشن میں لکھا گیا ہے، کہ بلوچوں کے باپ بلو۔ ازبکوں کے باپ ازبک اور افغانہ تین بھائی تھے۔

ایک اور روایت بتاتی ہے، کہ افغان یہودیوں کے دس طائفوں میں سے ایک طائفہ ہے۔ جسکو بخت نصر کے زمانے میں فلسطین نامی کسی شخص نے فلسطین سے افغانستان کی طرف بھیجا تھا۔ ایک روایت ان کو قیس کی نسل بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاریخ فرشتہ نے ان پر قبطی ہونے کی مہر مثبت کردی ہے اور ان کو فرعون کی اولاد کی صورت میں متعارف کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ بعضوں نے اپنے قیاسات کے پیمانے لگاکر موجودہ درہ خیبر کو یہودیوں کا خیبر کا قلعہ گردانا ہے۔

تاریخ فرشتہ کی یہ روایت بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ خالد بن عبداللہ جب کابل کی حکومت سے معزول ہوا تو عربوں کے ایک گروہ کے ساتھ کابلیوں کی اعانت اور رھنمائی میں کوہ سلیمان جاکر سکونت اختیار کرلی اور اپنی بیٹی کو ایک نومسلم افغان معتبر کی نکاح میں دیدیا۔ اس لڑکی سے جو اولاد پیدا ہوئی اُن میں سے دو کو شہرت ملی۔ ایک لودی تھا اور دوسرا سور جن کی اولاد افغانوں کے لودی اور سوری قبائل کے ناموں سے مشہور ہیں۔ اور لودیوں اور سوریوں نے ھندوستان پر حکومت کی ہے۔

روایات کے سلسلے میں تاریخ فرشتہ میں مشہور تصنیف مطلع الانوار سے بھی ایک حوالہ نقل کیا گیا ہے۔ اس میں بڑے پتے کی بات یہ لکھی ہے کہ افغان فرعون کے قبیلہ میں سے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس کافر کو شکست دی تو بہت سارے قبطیوں نے توبہ کرلی اور موسیٰ کا دین قبول کرلیا۔ ان میں سے ایک فرقہ جو

فرعون کے ساتھ نہایت گہرا عقیدہ رکھتا تھا اور اپنی انتہائی جہالت کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے روگردان رہا جلاوطن کردیا گیا۔ یہ فرقہ ھندوستان آیا اور کوہ سلمان میں سکونت اختیار کرلی اور افغان کے نام سے موسوم ہوا۔ جب کبھی ابرھہ کعبے چلا جاتا تو دور اور نزدیک سے بہت سارے کفار کعبہ آکر اس کی متابعت کرتے۔ ان میں افغان بھی ایک طائفہ بنا کر اس کے پاس اپنی باری پر پہنچ گئے ان کو سزا ملی اور زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔

فرانسیسی تاریخ دان اور محقق فوشے اپنی کتاب ایرانی تمدن میں سلطنت افغانستان کے قیام سے قبل افغان کے عنوان سے لکھتے ھیں کہ افغانوں کے سچے آریہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور یہ بات صرف انگریزوں کے دل کی خلش رہی ہے کہ وہ ھمیشہ تورات کے گمشدہ پوتے کی تلاش میں سرگردان اور پریشان رہتے ھیں۔ ایک تھوڑے سے وقت کے لئے افغانوں نے ان مذھبی جنونیوں کے لئے امید کی ایک کرن پیدا کردی تھی۔ وہ اس طرح کہ اگرچہ افغان ھرات اور بلخ کے پناہ گزین یہودیوں کو زیادہ گھاس نہیں ڈالا کرتے تھے پھر بھی اپنے آپ کو بنی اسرائیل یا اسرائیلیوں کی اولاد گرداننا۔ دوسرے اس کی ایک وجہ افغانوں کی سادگی اور یہودیوں کی چالاکی بھی ہوسکتی ہے۔)

پشتونوں یا افغانوں کی نسل کے بارے میں مرحوم عبدالحئ حبیبی کی تحقیق سب سے زیادہ قابل قبول اور حقیقت پر مبنی ہے۔ حبیبی صاحب خیبر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ خیبر کا نام عربستان سے نہیں آیا ہے۔ پرانے مصنفوں میں سے کچھ نے جو اس نام کی دلیل سے پشتون نسل کو یہودیوں سے ملا دیا ہے وہ بالکل باطل اور بے بنیاد ہے تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ھنحا منشیوں کے دور اقتدار میں ان کی مملکت میں یہودی کافی تعداد میں موجود تھے۔ اس زمانے کے ایرانی علاقوں میں یہودیوں کی موجودگی کی تاریخ شہادت کے طور پر عرب اور بربر نامی فرانسیسی زبان میں لکھی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ خسرو پرویز نے سنہ ۶۱۴ء میں بیت المقدس کو ھیراکلیس سے قبضہ

کرلیا۔ کلیساؤں کو تباہ و برباد کر دیا۔ عیسائیوں کو قتل کر دیا مگر یہودیوں کو کسی قسم کی اذیت نہیں پہنچائی۔ یہودیوں نے اسی ہزار گرفتار شدہ عیسائیوں کو خریدا اور اپنی تفریح کے لئے ان کا سر قلم کر دیا۔ یونان کے عیسائیوں نے بھی بیت المقدس کو ایرانیوں سے واپس چھین لینے کے بعد یہودیوں کے سروں پر یہی بلا نازل کر دی۔

موجودہ افغانستان احمد شاہ ابدالی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے اسی نام سے موسوم نہیں تھا مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس سرزمین پر افغان قوم موجود نہیں تھی۔ چوتھی صدی ہجری میں لکھی ہوئی کتاب حدود العالم میں ایک عنوان اس شکل میں ہے کہ ھندوستان کے نواحی شہر اور دیہات اور ان میں افغان بستے ھیں تاریخ یمینی میں سلطان محمود غزنوی کے لشکر میں افغانوں کا ذکر ہوا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں بھی سلطان محمود کے سپاہیوں میں افغانوں کی موجودگی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

ان حوالوں کی روشنی میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ محمود غزنوی کے لشکر میں قریباً سب کے سب سپاہی پشتون یا افغان تھے۔

ابو ریحان البیرونی نے افغانوں کا ذکر بار بار کیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ لوگ ھند کے مغربی کوھستان میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس کوھستان کا نام کوہ سلمان ہے عرب سیاح ابن بطوطہ آٹھویں صدی کے اوائل میں اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ کابل ماضی میں ایک بڑا شہر رہا ہے جہاں ایرانی عجم قبیلہ افغان زندگی بسر کر رہا ہے۔

آج افغان نام ایسے تمام لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو موجودہ افغانستان میں اپنی زندگی بسر کر رہے ھیں۔ اس ضمن میں پشتو، پارسی یا دری، ترکی اور بلوچی بولنے والے سبھی لوگ شامل ھیں۔ یہ بات صرف برصغیر ھند و پاکستان تک محدود ہے جہاں یہ لوگ پٹھان کے نام سے موسوم ھیں جن کی زبان پشتو ہے پشتو بولنے والے لوگ خود کو پشتون کہلانا زیادہ پسند کرتے ھیں کیونکہ ان کے بنیادی ناموں میں یہی نام موزوں ترین ہے اس بارے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۱۹۶۸ء ایڈیشن میں لکھا ہے کہ افغان

نام کا سب سے قدیم استعمال ھندوستانی ماہر نجوم وروہا میہیرا نے چھٹی صدی عیسوی میں لفظ اَوگنہ کی صورت میں کیا ہے۔ اصل افغان ایسے قبائل پر مستمل ھیں جو ایک ایرانی زبان پشتو بولتے ھیں اور ان کے بارے میں سب سے قدیم معلومات کے مطابق کوہ سیلمان کے پہاڑی سلسلے میں مرکزیت رکھتے ھیں۔ ان کی روایتی تاریخ لوک کہانیوں میں پائی جاتی ہے اور ان میں سے کوئی پانچ سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ایسی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے کہ افغانوں نے موجودہ افغانستان کے ان علاقوں کے علاوہ جہاں پشتو زبان بولی جاتی ہے زمانہ قدیم میں کسی اور علاقہ پر قبضہ کیا ہو اور صرف موجودہ زمانے میں تاجکوں اور ہزاروں کے مقبوضہ علاقوں میں سکونت اختیار کر لی جن پر انہوں نے جاگیردارانہ غلبہ حاصل کر لیا۔ غالب مقامی زبان کی حیثیت سے پشتو کی سابقہ تحریر شدہ تقسیم شمال مشرق میں جلال آباد کے نزدیکی شمالی حصوں میں جنوب میں قندھار اور وہاں سے مغرب کی طرف فراہ اور سبزوار تک ہوئی ہے پشتو پاکستان کے شمال مغربی علاقوں اور وہاں سے سلسلہ کوہ سلمان سے ہوتی ہوئی کوئٹہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ جغرافیائی اور سماجی لحاظ سے .... ھیروڈوٹس اور دوسرے ماخذ سے بڑے بڑے علاقے پہچانے جا سکتے ھیں اس طرح سے باختر آمو دریا کا طاس ہو سکتا ہے۔ اراکوزیا قندھار کا اڑوس پڑوس آریا ہرات کے آس پاس ہری رود کی وادی کا علاقہ۔ جبکہ ارچیانا جو کہ کتیوں اور دوسرے یونانی ماخذ میں ملتا ہے جنوب مغربی افغانستان میں غالباً سیستان کے کچھ حصوں پر مشتمل رہا ہے۔ سیندوا اور گندھارا کے نام سیندا اور پاکستان کے شمال مغربی علاقوں کے ساتھ منسلک کئے جا سکتے ھیں جو غالباً افغانستان کے علاقوں میں شامل نہیں تھے

ہیروڈوٹس کا پکتویس بھی قابل ذکر نام ہے جو پشتو بولنے والی نسل پشتون یا پٹھان ناموں کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ پٹھان ایک ایسا نام ہے جو افغانستان کے جنوب مشرقی اور پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں پشتو زبان بولنے والوں

کو دیا گیا ہے۔ پشتو جو ایک مشرقی ایرانی زبان ہے دو لہجے رکھتا ہے ملایم کا نام پشتو ہے جیسے افغانستان کے قبائل بولتے ھیں اور سخت لہجہ پختو ہے جیسے پاکستانی قبائل بولتے ہیں پشتو لہجوں کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا برٹیانیکا کی یہ وضاحت صحیح نہیں ہے۔ بلکہ پشتو زبان کے تین بڑے بڑے لہجے ھیں، خلجی، قندھاری اور یوسفزئی اور ان میں سے ھر ایک اپنے اپنے مختلف چھوٹے لہجے بھی رکھتا ہے۔ جیسے قندھاری میں کاکڑی لہجہ۔ یا شمال مغربی لہجے میں وزیر محسود خٹک اور باجوڑ لہجے۔ اسی طرح ھر قبیلہ اپنے مخصوص انداز گفتگو سے بھی پہچانا جاتا ہے۔

جس طرح پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔ پشتو ایک آریہ زبان ہے اور اس کے بولنے والے آریہ نسل سے ھیں۔ سات دریاؤں، سپت سیندھو کی سرزمین کے زرخیز چراگاہوں کی طرف سے مرکزی وطن آکسس کی وادی باختر سے کوچ کرتے ہوئے آریہ قبائل کے راستے میں وہ آریہ قبائل جو بہت پہلے مشرقی علاقوں پر قابض ہو چکے تھے گزرنے والوں کے لیئے رکاوٹ بنے اس بنا پر دس آریہ قبائل میں ایک بڑی جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں آگے بڑھنے والوں کے لیئے راستے کھل گئے اس جنگ میں حصہ لینے والے دس قبائل۔ الفیا۔ پکھت۔ بھالانا۔ شیوا۔ ویشانن۔ الونیا۔ دروھویا۔ توروا سا۔ یادو اور پورو کے ناموں سے پہچانے جاتے ھیں۔ ان میں سے الینا موجودہ کلش لوگ تھے۔ بھالانا درہ بولان تک کے علاقے میں بسنے والے لوگ تھے۔ شیوا کابل کے آس پاس علاقے میں زندگی بسر کررہے تھے پورو دریائے سندھ اور گندھارا کے علاقوں میں رہتے تھے۔ پکھت وہ آریہ قبیلہ تھا جو آجکل پشتون یا پٹھان کے نام سے مشہور ہے پکھت لوگ زیادہ تر آریانا ویجہ کے ان حصوں میں آباد تھے جو اراکوزیا اور گندھارا کہلائے جاتے تھے۔ پکھتوں کے وجود کے آثار باختر، ہندوکش کے شمالی علاقے، کوہ سفید کے دونوں اطراف آریانا کے جنوبی علاقے، پارتیا۔ اترک اور کانیانا میں پائے گئے ھیں، پکھت جس سرزمین پر زندگی بسر کرتے تھے اس کا نام بعض

تاریخی شہادتوں میں پکھتیکا بتایا گیا ہے۔

پکھت آریوں کا ایک بڑا قبیلہ تھا یہ لوگ زیادہ تر پہاڑوں میں رہتے تھے اور مختلف شاخوں میں تقسیم تھے جن میں سے گندھاری، اپارتی، ستاگیدی، دادیکی اور بریسایا بہت مشہور رہیں، گندھاری گندھارا کے لوگ تھے۔ اپارتی وہ لوگ ہیں جن کا نام وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے جو اپارتی سے اپریتی بنے، اپریتی سے اپریدی اور موجودہ وقتوں میں افریدی بھی کہلائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ستاگیری پہلے ستک بنے اور بعد میں خٹک۔ دادیکی کا نام تاجیک میں بدلا اور بریسایا کا بڑیچ میں۔

آریوں کی زبان ابتداء میں ایک تھی، بعد میں جب یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئے تو مختلف علاقوں میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان کی بناوٹ میں بھی فرق آیا۔ آریوں کی اس زبان کا نام معلوم نہیں مگر تحقیق کرنے والوں نے اس کو آریا، آریک، اور انڈو یورومین کے نام دیئے ہیں اس زبان سے جو زبانیں وجود میں آئی ہیں ان میں سنسکرت، ژند، لاتین، جرمن سلاؤ اور یونانی بڑی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہیں۔

پکھت آریوں کی زبان پشتو ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پکھت جس سرزمین پر پہلی دفعہ بس گئے وہیں سکونت اختیار کرلی پہاڑوں کی پاک تازہ ہوا اور خوبصورت پرامن ماحول کو پسند کرنے کی بناء پر انہوں نے کسی اور طرف کوچ کرنے سے گریز کیا۔ اس لئے ان کی زبان پشتو بھی آریا زبان کی ابتدائی شکل میں کافی حد تک برقرار رہی ہے دوسرے لفظوں میں یہی زبان اپنی قدیمی ہیئت میں آریوں کی بنیادی زبان ہے۔ مگر لسانیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ پشتو آریا یا انڈو ایرانی یا باختری زبانوں سے نکلی ہوئی زبان ہے اور اوستا کی زبان ژند سے زیادہ قریب ہے۔ پشتو زبان کی چار مخصوص آوازیں ہیں۔ جن میں سے کچھ سلاؤ زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں مگر دنیا

کی بیشتر دوسری زبانوں میں ان کا وجود نہیں ہے۔ ان میں سے ایک آواز لفظ پکھت میں۔کھ۔ سے ان ترقی یافتہ زبانوں میں ظاہر کیا گیا ہے جن زبانوں میں پشتو زبان کے بارے میں تحقیقات ہوئی ہیں۔ یا پشتون نسل کے بارے میں تاریخ پر کام ہوا ہے۔ یہ آواز سنسکرت زبان میں بھی موجود ہے اور سنسکرت زبان کے جاننے والے اس کی ادائیگی مختلف لہجوں میں کرتے ہیں۔ سنسکرت کی دیوناگری رسم الخط میں اس آواز کے لئے جو نشان یا حرف مقرر ہوا ہے ھندوستان کے مختلف علاقوں کے برھمن اس کی ادائیگی۔کھ۔ کے ساتھ۔چھ۔کش۔ سے بھی کرتے ہیں اسی طرح ھمالیہ کے دامن اور خاص طور پر گڑوال کے برھمن یہ ادائیگی ہو بہو ایسا کرتے ہیں جیسے کہ خود پٹھان اپنی زبان پشتو کے نام میں اس آواز کی صحیح ادائگی کرتے ہیں پشتو زبان چونکہ تازی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اس لئے اس مخصوص آواز کے لئے بھی ایک حرف کا اضافہ اس طرح کیا گیا ہے کہ حرف۔س۔ پر ایک نقطہ اوپر اور ایک نیچے لگا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح آواز کے لئے۔ښ۔ ایک حرف بنا دیا گیا ہے اور پښتو کے نام اور دوسرے الفاظ کی صحیح ادائگی اور تحریر میں استعمال ہو رہا ہے اور لکھنے میں پښتو کا صحیح نام پښتو لکھا جا سکتا ہے۔

اسی حوالے سے پښتون نسل کا جو قدیمی نام پکھت کی شکل میں لکھا گیا ہے وہ اپنی اصلی شکل اور ادائیگی میں۔ پښت۔ ہے۔ یہی نام دیو ناگری رسم الخط میں لکھا جائے تو اس کو ھندوستان کے مختلف حصوں کے برھمن پکھت۔پکشت۔پچھت۔ یا پښت پڑھیں گے۔ پشت یا پخت کوئی نہیں پڑھیگا۔ پشت یا پخت حرف موجودہ وقتوں میں اردو یا انگریزی زبانوں میں استعمال ہو رہے ہیں کیونکہ ان زبانوں میں اس آواز کی صحیح ادائگی کے لئے کوئی لسان یا حرف ان زبانوں کی اپنی ساخت کی وجہ سے نہیں ہے۔ پخت اور پشت دونوں میں سے پښت کی ادائیگی صحیح نہیں ہے۔

تحریر مقدس خان معصوم

پشتو زبان و ادب

پشتو ادب کا جائزہ لینے سے پہلے پشتو زبان کے متعلق یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس زبان نے کس خطے میں جنم لیا اور وہ کونسی زبان تھی جس سے اس کا مایۂ خمیر تیار ہوا، چونکہ پشتون آریوں کی آمد سے پہلے اپنے پرانے وطن "بختی ریکا" میں رہتے تھے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پشتو بہت پرانی زبان ہے لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتنی پرانی زبان ہے اور کس زبان سے نکلی ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف قیاس پر مبنی ہے، کیونکہ اس زبان کے بولنے والے یعنی پشتون خود آج تک یہ ثابت نہیں کر سکے کہ وہ آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں یا کہ بنی اسرائیل ھیں۔ اس ضمن میں بہت سے تاریخی حوالے بھی سامنے آئے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ آج تک یہ ایک متنازعہ مسئلہ ہے اس میں شک نہیں کہ پشتو زبان کے محققین و مورخین اس تنازعہ کو حل کرنے کی تگ و دو میں مسلسل کوشاں ھیں لیکن بات پھر وہیں پر آکر رکتی ہے کہ کس ذریعے سے اس کی بنیاد تک پہنچا جائے۔

بعض مورخین کہتے ھیں کہ پشتو زبان سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ اور بعض اس کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پشتو زبان اگر سنسکرت سے ماخوذ ہوتی تو لازماً اس کا رسم الخط اگر نہ ہوتا تو قریب ضرور ہوتا۔ لیکن قدیم رسم الخط سے کہیں بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس زبان کا کبھی سنسکرت زبان سے رابطہ رہا تھا، مگر بعض مورخین کا خیال ہے کہ پشتو زبان سنسکرت سے نکلی نہیں بلکہ اس کے زیر اثر رہی

ہے۔ اور چونکہ آریائی قوم پشتونوں کے علاقے میں کافی مدت تک رہی ہے اس لحاظ سے پشتو پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ قدیم پشتو کی نہ صرف شکل وصورت بدل گئی بلکہ یہ اندازہ کرنا مشکل ہو گیا کہ پشتو کونسی زبان ہے اور سنسکرتی کونسی ہے۔

بعض محققین نے پشتو کو سامی زبان کہا ہے لیکن اس کے لیے کوئی ایک بھی مستند حوالہ نہیں ملتا لہذا یہ بات بھی ماننے کے قابل نہیں کہ پشتو کا تعلق سامی زبان سے رہا ہے یا یہ کہ پشتو خود سامی ہے اور بیشتر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ پشتو آریائی زبانوں سے ہے اور خود پشتون آریائی قوم کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو تین ہزار سال قبل بلخ، بخد اور دریائے آمو کے گردو نواح میں آباد تھی اس کے ثبوت کے لئے فقیر حسین ساحر چند ماہرین لسانیات کی رائے پیش کرتے ہیں مثلاً۔

پروفیسر ڈورن کہتا ہے کہ پشتو زبان، تراکیب، الفاظ اور قواعد کے اعتبار سے عبرانی زبان سے کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتی بلکہ یہ صوتی اور میکانکی طور پر آریائی زبان کی ایک شاخ ہے۔

ایک اور ماہر لسانیات الفنسٹن دیگر محققین کی اس رائے سے کہ پشتو کا تعلق سامی زبان سے ہے اختلافات کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے ۲۱۸ الفاظ کی تحلیل اور تجزئے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان الفاظ میں سے ایک بھی لفظ سامی زبان سے تعلق نہیں رکھتا البتہ ۵ فیصد الفاظ ایسے ہیں جو کُردی زبان سے متعلق ہیں اور یہ انڈو آرین زبان کہلاتی ہے۔

ڈاکٹر ولیم ہنری کہتا ہے کہ پشتو زبان ایک طرف سنسکرت اور دوسری طرف اوستا سے قریب ہے، اس قربت کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبانیں یعنی پشتو، سنسکرت اور اوستا آریائی زبان کی تقسیم سے پہلے ایک چیز تھیں۔

اس تجزئے کے بعد یہ بات معلوم ہو گئی کہ پشتو زبان کا سامی زبان سے ہرگز

کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ ہند یورپی خاندان کی ہند ایرانی یا ہند آریائی شاخ سے تعلق رکھتی ہے یعنی پشتو زبان قدیم ایرانی زبان سے نکلی ہے اور اس کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ اس کا معتبر ثبوت یہ ہے کہ پشتو میں فارسی زبان کے لاتعداد الفاظ موجود ہیں اس ضمن میں ڈاکٹر مسعود حسین لکھتے ہیں، "یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ ہند یورپی زبان بولنے والے آریہ، اپنے داخلہ ہندوستان سے قبل عرصہ تک مشرقی ایران میں قیام کرتے ہیں جہاں ان کی زبان ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ہند ایرانی منزل میں پہنچ جاتی ہے۔"

اس سے مطلب یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب آرین ایران میں داخل ہو کر کافی عرصہ تک قیام پذیر ہوئے تو وہاں کے لوگوں نے ان کی زبان کو جاننے کے لئے اور اپنی زبان ان تک پہنچانے کے لئے ہر دو زبانوں کو ایک دوسرے میں کافی حد تک گڈمڈ کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو ایرانیوں کی اصل زبان اپنی اصل حالت میں قائم رہ سکی اور نہ ہی آریوں کی زبان نے اپنے آپ کو ایرانی زبان میں ملنے سے بچنے کی کوشش کی اور چونکہ بعد میں آرین پشتون علاقوں میں آکر آباد ہوئے اس طرح وہی عمل یہاں پر بھی دہرایا گیا اور پشتو زبان ہر دو زبانوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

لیکن یہاں پر اب بھی یہ سوال اپنی جگہ پر جواب طلب ہے کہ یہ زبان کتنی قدیم ہے کیونکہ اس کے متعلق عام لوگوں کا تو کیا بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی تصدیق کئے بغیر یہ دعوی کرتے ہیں کہ چونکہ پشتون قوم پانچ ہزار سال پہلے سے موجود ہے لہذا پشتو زبان بھی پانچ ہزار سال پرانی ہے، مگر بہت سے لوگ اس کی مخالفت کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کسی بھی چیز کی اصلیت جاننے کے لئے یا تو تحریری ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے یا آثار کی اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کی قدامت کو ظاہر کرنے کے لئے کوئی تحریری مواد یا آثاری ثبوت ہے بھی کہ نہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے جس کے بل بوتے پر فخریہ کہا جا سکے کہ پشتو زبان

پانچ ہزار سال قدیم ہے۔ تو چلیے اگر اتنی قدامت کا ثبوت نہیں تو کم از کم ثبوت کیا مل سکتا ہے؟ اس کے لیے جناب فارغ بخاری کی رائے۔

فارغ بخاری صاحب کہتے ہیں کہ آج سے پہلے بہت سے محققین نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ پشتون قوم چودہ سو سال قبل از مسیح موجود تھی۔ اور جدید تحقیقات کے مطابق ساڑھے تین ہزار سال قبل از مسیح تک اس قوم کی موجودگی کے آثار مل چکے ہیں اب اگر اس تحقیق کو صحیح مان لیا جائے تو پھر یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ پشتو زبان بھی اتنی ہی قدیم ہے کیونکہ کوئی بھی قوم زبان کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ وہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ ہم اگر پشتون قوم کے ساتھ ساتھ پشتو زبان بھی اتنی ہی قدیم تصور کریں جتنی قدیم کہ یہ قوم خود ہے تو پھر اس زبان کے شعر و ادب سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے۔

اب آتے ہیں اس طرف کہ اگر پشتو ادب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے تو پھر دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں پیچھے کیوں رہی ہے کیا اس زبان کے ادیبوں اور شاعروں نے جان بوجھ کر اس طرف توجہ نہیں دی یا کہ اس کی ترقی کی راہ میں اور عوامل رکاوٹ بنتے رہے۔ اس بارے میں محققین اور مورخین کی مختلف آراء ہیں کسی کا خیال ہے کہ یہ زبان اتنی سخت ہے کہ پشتونوں کے علاوہ اور کوئی اس پر عبور حاصل نہیں کر سکتا اس لئے اس کو پشتونوں کے علاوہ اور کسی نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح نہ تو اس کے ادب کو پروان چڑھنے کا موقع ملا اور نہ اس کے ادب کو دیگر زبانوں میں متعارف کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور بعض لوگ اس کی پسماندگی کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ چونکہ پشتون قوم طبیعت اور مزاج میں ہر وقت اپنی عزت نفس اور انا کا خیال لئے ہوئے شاہی درباروں سے نفرت کو جگہ دیتی رہی تھی اس لئے درباری زبان کے طور پر پشتو زبان کو موقع نہ مل

سکا ۔ نیز حکومتوں کی طرف سے بھی اس کی مناسب پذیرائی نہ ہو سکی اور نتیجتاً یہ زبان دوسری زبانوں کے مقابلے میں کافی حد تک پسماندہ رہ گئی ۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ پشتو ادب اپنی جگہ جامد و ساقط ہے اس سے پہلے جو ذکر کیا جا چکا ہے کہ پشتون قوم جدید تحقیقات کے مطابق بہت قدیم قوم ہے اور چونکہ انسان اپنی پیدائش کے ساتھ ہی ادب اپنے ساتھ لاتا ہے لہذا پشتو ادب بھی اتنا ہی قدیم ہے لیکن تحریری شکل میں امیر کروڑ کی ایک نظم ملی ہے جو کہ پشتو ادب میں قدیم نظم کے طور پر مانی گئی ہے نیز یہ بھی کہ یہ اولین نظم ہے اور امیر کروڑ دوسری صدی ھجری میں گزرا ہے اس طرح پشتو ادب میں اولین آثار کے طور پر اگر امیر کروڑ کی نظم کو صحیح مان لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ پشتو ادب کو تحریری شکل میں دوسری صدی ہجری میں رواج ملا ہے لیکن پشتو ادب کے ایک مشہور محقق اور مورخ حبیبی مرحوم رقمطراز ہیں کہ پشتو شعر اسلام کے ابتدائی دور میں بھی ترقی یافتہ صورت میں موجود تھا لیکن وہی بات کہ تحریری ثبوت ناپید ہے ۔

علاوہ ازیں محمد ہوتک کی کتاب "پٹہ خزانہ" نثر کی صورت میں پشتو ادب کا ایک قدیم اور بیش بہا خزانہ ہے جو نسل در نسل پشتو ادب کے پیاسے اس کے مطالعے سے اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ کتاب بھی متنازعہ صورت اختیار کر گئی ہے کچھ اس کو اصل اور کچھ نقل کہتے ھیں بہر حال اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی کتاب ہے جس میں محمد ہوتک نے امیر کروڑ کی مذکورہ نظم محفوظ کی ہے ۔

تو معلوم یہ ہوا کہ پشتو ادب ہر دور میں حالات اور تقاضوں کے مطابق اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے اس کی رفتار کبھی تیز اور کبھی سست پڑ جاتی ہے لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں منزل مقصود اگر نزدیک نہیں تو دور بھی نہیں ہے ایک نہ ایک دن دوسری زبانوں کے ادب کے مقابلے میں برابری کا دعویٰ کر سکے گا

کیونکہ پشتو زبان زمانے سے زندہ اور فعال ہے اس کے خلاف اور حق میں ایک زمانے میں ادیبوں نے آپس میں معرکہ آرائی شروع کی تھی اگر پیر روشان ایک رائے کا اظہار کرتا تو اخوند درویزہ دوسری رائے کا اس طرح ان کے معتقدین بھی دو گروہوں میں واضح طور پر بٹ گئے تھے اور خطرہ تھا کہ پشتو کے شعر و ادب کو سخت نقصان پہنچے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ البتہ معمولی سا فرق اس کی رفتار میں آیا۔ لیکن خوشحال خان خٹک کے اس میدان میں آنے سے پشتو ادب کی رفتار پھر سے اتنی تیز ہو گئی کہ نہ صرف گزشتہ کمی پوری ہو گئی بلکہ بڑی تیزی سے منزلیں طے کرتی گئی۔ اس مجاہد نے قلم کو اس طرح چلایا کہ پشتو ادب کے نقوش میں چار چاند لگ گئے۔ انہوں نے پشتو ادب کے حوالے سے نہ صرف اپنا نام پشتونوں کے دل و دماغ پر ثبت کیا بلکہ پشتو زبان و ادب کی یک و تنہا اتنی خدمت کی کہ لوگ آج بھی انگشت بہ دندان ہیں۔

اسی طرح رحمان بابا اور ان کے مکتب فکر کے شاعروں نے اپنے تئیں پشتو ادب کو بہت آگے بڑھایا۔ ان کا دور ختم نہ ہونے پایا تھا کہ حمید بابا نے شعر و ادب کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور پھر یہ سلسلہ اس طرح جاری ہوا کہ نثر و نظم دونوں میں کام ہونے لگا اس میں شک نہیں کہ نظم کے مقابلے میں نثر میں بہت کم کام ہوا ہے لیکن ہوا ضرور ہے۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ پشتو ادب کے حوالے سے آج کے دن ہم بھی اس مقصد کے لئے اکھٹے ہوئے ہیں کہ نظم اور نثر کو برابر کی اہمیت دے کر اس کی ترویج و ترقی کے لئے نئے زاویئے سے کام کریں۔ تاکہ آئندہ نسلیں ہم سے یہ شکوہ نہ کر سکیں کہ ہم نے پشتو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ویسے تو موجودہ دور میں نظم اور نثر میں نئے نئے تجربے کئے جا رہے ہیں۔ نثر میں ناول جو کہ پہلے ادب کا حصہ نہیں مانا جاتا تھا اب

مانا گیا ہے۔ پشتو ادب میں عرصے سے داخل ہو چکا ہے ڈرامہ اور افسانے پر بھی کام ہو رہا ہے، سفرنامے بھی منظرِ عام پر آرہے ہیں۔ اسی طرح شارٹ افسانہ بھی متعارف ہوا ہے اور اچھے نتائج لا رہا ہے۔ علاوہ ازیں نظم میں غزل کو اولیت دی گئی ہے۔ مثنوی کو پسِ پشت ڈالا گیا اور چار بیت کو تو اب آہستہ آہستہ تقریباً ترک کیا جا رہا ہے جو کہ پشتو ادب کے لئے نقصان کا باعث ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ نئی نسل کے شعراء تو چار بیت سے بالکل نابلد ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

لہٰذا آخر میں اسی حوالے سے نئی نسل کے شعراء سے درخواست ہے کہ وہ اس صنفِ شاعری کو ترک کرنے کی کوشش نہ کریں، آپ نئے نئے تجربے ضرور کریں لیکن عوامی ادب کو ساتھ لے کر کیونکہ عوامی ادب کے طفیل ہی آج ہم فخر سے سر اونچا کر کے چلتے ہیں کہ پشتو ادب یہاں تک زندہ اور تابندہ یہاں تک آپہنچا۔ اگر عوام کے سینے اس ذوق سے خالی اور دل متنفر ہوتے تو آج پشتو زبان و ادب کو ہم اور آپ اس مقام پر نہ دیکھ پاتے۔

والسلام

پشتو ڈرامہ

سعد اللہ جان برق

پشتو ڈرامہ میں ایک نووارد ذریعہ اظہار ہے لیکن ماننا پڑے گا کہ مختصر سی مدت میں پشتو ڈرامہ نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہم اسے دنیا کے ترقی یافتہ زبانوں کے مقابل رکھ سکتے ہیں مقدار کے لحاظ سے پشتو میں ڈرامہ شاید کم ہو لیکن معیار کے لحاظ سے ہرگز کم نہیں ہے۔

پشتو ڈرامے کے ساتھ ایک اتفاق یہ ہو گیا کہ اس کی پیدائش عین جنگ آزادی کے درمیان ہوئی چنانچہ پشتو ڈرامہ ابتدا ہی سے ایک بالغ ڈرامے کی حیثیت سے اُبھرا اور اس نے ابتدائی منازل کو بہت ہی کم عرصے میں طے کیا پشتو کے ابتدائی ڈرامے وہ تھے جو عبدالاکبر خان اکبر نے اتمان زئی ہائی سکول میں سٹیج کیئے یہ چھوٹے چھوٹے ڈرامے ہوتے تھے جنہیں عبدالاکبر خان اکبر لکھتے تھے اور سکول کے طلبا ان میں اداکاری کے جوہر دکھاتے ظاہر ہے کہ مناسب لوازمات اور وسائل کے نہ ہونے کے باعث یہ ڈرامے خام قسم کے ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں ایک بڑی چیز ہوا کرتے تھے۔ یہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا۔ یہی عبدالاکبر خان اکبر ہیں جن کا مشہور و معروف ڈرامہ "جونگرگہ" (جھونپڑی) ۱۹۴۵ء میں شاہی باغ کے مقام پر پولیٹیکل کانفرنس کے موقع پر سٹیج کیا گیا تھا۔ جنگ آزادی کے سلسلے میں یہ ڈرامہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پشتو ڈرامے کے ابتدائی دور میں قاضی رحیم اللہ کا تمثیلی ڈرامہ "نئی روشنی" بھی ایک قابل ذکر ڈرامہ ہے یہ ایک سماجی اور اصلاحی ڈرامہ ہے قاضی صاحب

اپنے اس ڈرامے کے متعلق خود لکھتے ہیں۔کہ

میں نہ ڈرامہ نگار ہوں اور نہ یہ میرا پیشہ ہے لیکن یہ بات برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی پشتو پر تہی دامنی کا الزام لگاتے ہوئے یہ کہے کہ پشتو میں لٹریچر پن ہے۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ پشتو کے لٹریچر میں ہر موضوع پر لٹریچر موجود ہے مگر وہ نظم میں ہے۔

میں یہ ڈرامہ ہر پشتون کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کروں گا جب وہ اپنے بیٹوں کو تعلیم حاصل کرنے بھیجیں تو کیا سلوک ان کے ساتھ ہونا چاہیئے اور جب بیٹوں کو بھیجیں تو ان کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیئے نیز بے علم و تعلیم مرد اور عورتیں معاشرے میں کیسے عضوِ معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

قاضی صاحب کا یہ ڈرامہ اتنا مقبول ہوا کہ افغانستان کے حکمران غازی امان اللہ خان نے اس کی خاصی تعداد منگوالی تھیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا پشتو ڈرامہ جنگ آزادی کے جلو میں پیدا ہوا پھلا اور پھولا اور یہ اس لئے کہ جنگ آزادی لڑنے والوں کو یہ ایک موثر ذریعہ اظہار نظر آیا چنانچہ جہاں انگریزی استعمار کے خلاف اس ذریعہ اظہار کے ذریعے جہاد کیا گیا وہاں جنگ آزادی کی وجہ سے پشتو ڈرامے نے بڑی تیزی سے ترقی بھی کی۔ ۱۹۳۰ء میں ایک ڈرامہ "درد" چارسدہ میں سٹیج کیا گیا۔ یہ امیر نواز خان جلیا کا لکھا ہوا تھا۔ اس ڈرامے سے متعلق تمام اداکار اور فنکار گرفتار کرلیے گئے اور انگریزی حکومت نے ان کو سخت اور لمبی سزائیں دیں۔

اسی سال عبدالخالق خلیق کا ڈرامہ "خدائی خدمتگار" زیارت گاہ کا صاحب میں سٹیج ہوا اور میاں عبدالرازق کا ایک ڈرامہ "دجنت ماڼرې" (بہشتی محل) اسلامیہ کالج میں پیش کیا گیا۔ ان ڈراموں نے ڈرامے کا فن اور شوق عام کردیا اور مختلف

مقامات پر بہت سے چھوٹے بڑے ڈرامے پیش کئے جانے لگے یہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء کا زمانہ تھا۔

پھر ۱۹۴۵ء میں پشتو کا وہ مشہور و معروف ڈرامہ میدان عمل میں آگیا جو پشتو ڈراموں میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ڈرامہ تھا "دوینو جام" جو محمد اسلم خان خٹک کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے اگرچہ اس ڈرامے کی تخلیق کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں کوئی اس سے عبدالکریم مظلوم کا لکھا ہوا کہتا ہے اور کوئی کسی اور کا۔ روایت ہے کہ محمد اسلم خان خٹک چونکہ پشاور ریڈیو کے ڈائریکٹر تھے اس لئے انہوں نے اس پر اپنا نام دے دیا۔ بہر حال یہ مسئلہ تو متنازعہ ہے اور رہے گا لیکن ڈرامہ کی نشر و اشاعت محمد اسلم خان خٹک ہی کے نام سے ہوئی ہے اور انہی کی تخلیق تسلیم کی جائے گی۔ یہ ڈرامہ پشتون کلچر کی بہترین نمائندگی کرتا ہے اس میں ان تمام معاشرتی عیوب کو نشانہ تنقید بنایا گیا ہے جو پشتون معاشرے خون ریزی اور جنگ و جدل کا باعث بنتے ہیں اور اسے ایک بہترین معاشرہ بننے کی راہ میں رکاوٹ بنتے رہے ہیں محمد اسلم خان خٹک اس ڈرامہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

یہ کوئی فرضی قصہ نہیں بلکہ اصل حقیقت ہے اس اصل حقیقت کو جاننے کے لئے میں صوبہ سرحد کی جیلوں میں گیا ہوں۔ پھانسی کے کمروں تک پہنچا ہوں اور پھانسی پانے والوں سے بات چیت کر چکا ہوں۔ ان تمام واقعات کو دیکھنے اور سننے کے بعد جو مصالحہ ہاتھ لگا اس کو میں نے ڈرامے کی شکل دے دی۔

دوینو جام کئی بار سٹیج بھی ہوا ریڈیو پر بھی نشر کیا گیا اور کتابی صورت میں بھی چھپ گیا۔ کیونکہ یہ ایک مکمل ڈرامہ ہے جس میں سٹیج اور ریڈیو دونوں کے لئے فنی مواد موجود ہے۔ اس ڈرامے کا اردو میں بھی "کٹورا بھر خون" کے نام سے ترجمہ ہوا اور انگریزی میں بھی (Aum ha Blood) کے نام سے منتقل کیا گیا۔

دو بیو جام کے بعد ریڈیائی ڈراموں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اسی دو بیو جام سے ملتا جلتا عبداللہ جان اسیر کا ڈرامہ "درس عبرت" بھی کافی مشہور رہا۔ لیکن ریڈیائی دور پر کچھ کہنے سے پہلے اس ابتدائی دور کے بارے میں اتنا اور عرض کرتا چلوں کہ پشتو ڈرامے کا بانی اگر کسی کو کہا جا سکتا ہے تو وہ عبدالاکبر خان اکبر ہے یہ مرحوم عبدالاکبر خان اکبر ہی ہیں جنہوں نے پشتو میں ڈرامے کی نہ صرف ابتدا کی بلکہ اسے رواج دیا اور اس کی مسلسل آبیاری کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ڈرامہ اپنے عروج کی طرف گامزن ہو گیا۔

عبدالاکبر خان اکبر کے بعد عبدالخالق خلیق کا کام بھی قابل ستائش ہے زیارت کاکا صاحب وغیرہ مقامات پر خلیق صاحب کے سیاسی ڈرامے خاصی شہرت رکھتے ہیں لیکن ان کا جو بہترین ڈرامہ مقبول ہوا وہ "شہیدہ سکینہ" ہے جو پشاور میں، اور مردان وغیرہ میں کئی مرتبہ سٹیج ہوا یہ ایک سوشل اور اصلاحی ڈرامہ ہے ان کا ایک اور اصلاحی ڈرامہ "خوږ ژوندون" (زلیست شیریں) بھی خاصا مشہور ہوا ان دونوں ڈراموں میں پشتون عورت کی حالت زار اور اس پر ہونے والے جبر وستم کو موضوع بنایا گیا ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب پشاور کا ریڈیو سٹیشن کام کرنے لگا تو ریڈیائی ڈراموں کا دور شروع ہوا جو ابھی تک جاری ہے اور اس میں انتہائی مثالی قسم کے ڈرامے اور ڈرامہ نگار منظر عام پر آئے ان ڈرامہ نگاروں میں جو ابتدائی ڈرامہ نگار قابل ذکر ہیں ان میں عبدالکریم مظلوم، امیر حمزہ خان شنواری، سمندر خان سمندر، داؤد شاہ برق، ہیں۔ یہ وہ ڈرامے ہوتے تھے جن میں اکثر ایک راوی کا سہارا بھی لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ایسے ڈرامے شروع ہوئے جو راوی کے بغیر انتہائی مکمل ڈرامے ہوتے ہیں یہاں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ ریڈیائی ڈرامہ ایک مخصوص قسم کی فنیت چاہتا ہے سٹیج یا ٹی وی ڈرامہ آنکھ اور کان دونوں کے مدد سے دیکھا جاتا ہے

جبکہ ریڈیائی ڈرامہ میں ڈرامہ نگار صرف کانوں کے ذریعہ سب کچھ پیش کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ تکنیکی لحاظ سے ایک لکھنے والے کے لئے ریڈیائی ڈرامہ نسبتاً مشکل ہوتا ہے البتہ اداکاروں کے لئے ریڈیو ڈرامہ آسان ہو جاتا ہے۔

اس دوسرے دور میں جو ڈرامہ نگار سامنے آئے ان میں قابل ذکر نام یہ ہیں۔ سید رسول رسا، اجمل خٹک، عبداللہ جان مغموم، رضا مہمندی، یوسف اورکزئی، ایس اے رحمان، ایاز داؤد زئی، مراد شنواری، اشرف مفتون، رشید علی دھقان، اشرف درانی، خیال بخاری، عبداللہ جان اسیر ان ریڈیائی ڈراموں کی تفصیلات کا احاطہ کرنا تو مشکل ہے۔ البتہ جو ڈرامہ انتہائی مقبول ہوئے وہ یہ ہیں۔ حمزہ شنواری کا "زړ ندہ کرے" (پن چکی والا) درے بخیلان (تین کنجوس) دسرو گتہ (سونے کی انگوٹھی) سمندر خان سمندر کا "یتیم" "جمالہ" اور سور بیزوان (لال بلاق) ایس اے رحمان کا نیمگرے خوب (ادھورا خواب)، علمی (نشانی) ایاز داؤد زئی کا "جل پری" اشرف مفتون کا ځوانی مرگ (جوانا مرگ) رشید علی دھقان کا ماتم کئے (ملاح) شوکت اللہ اکبر کا غم زپلے ژوند (غم کی ماری زندگی) رضا مہمندی کا میرہ مور (سوتیلی ماں) عبداللہ جان مغموم کا مړاوی گلونہ (مرجھائے پھول) طبع زاد ڈراموں کے علاوہ پشتو میں دنیا کی دیگر زبانوں کے معرکتہ الاراء ڈراموں کے تراجم بھی ہوئے جن میں تھامس ہارڈی، شیکپیئر برنارڈ شاہ وغیرہ کے متعدد ڈرامے قابل ذکر ہیں۔ ریڈیو کے علاوہ ٹیلیویژن نے بھی ڈرامے کو ایک نئی جہت نئی طرز اور نیا رخ دیا۔ یوں تو راولپنڈی اسلام آباد سینٹر سے بھی پشتو کے کچھ ڈرامے ہوئے تھے لیکن جب ۱۹۷۴ء میں پشاور سینٹر کا قیام عمل میں آیا تو ٹی وی پر باقاعدہ طور سے ڈراموں کا آغاز ہوا پشاور سنٹر سے پہلا پشتو ڈرامہ راقم الحروف کا "کہکنگ (مکائی) ٹیلی کاسٹ ہوا اس کے بعد اور بھی کئی اچھے لکھنے والوں کے بڑے اچھے اچھے ڈرامے ہوئے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے ٹی وی ڈراموں کے لکھنے والوں

میں محمد اعظم اعظم، خالقداد امیر، گل افضل خان، نثار محمد خان، نور البشر نوید
ہمایوں ہما، زیتون بانو، حمد اللہ جان بسمل، عمر ناصر، یونس قیاسی، ساحر آفریدی
افضل رضا اور راقم الحروف کے نام شامل ہیں۔
سٹیج کے سلسلے میں اتنا اور عرض کر دوں کہ قیام پاکستان کے بعد
پشاور میں سٹیج ڈرامہ تقریباً ختم ہو گیا اکا دکا ڈرامے ہوئے بھی مگر یہ سلسلہ
چل نہیں سکا۔ اب پاکستان کے دیگر شہروں میں سٹیج ڈرامہ ایک مرتبہ پھر عروج
حاصل کر رہا ہے۔ فی الحال پشتو سٹیج ڈرامہ تو شروع نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن
امید ہے کہ شاید ایک بار پھر یہ سلسلہ چل نکلے۔

[illegible]

پشتو ناول نگاری کا ایک جائزہ

ناول کو داستانوں کی ترقی یافتہ شکل کہتے ہوئے ابھی تک نقادوں کو تامّل ہے چند بنیادی فنی باتوں کے اختلاف کے باوجود دلیل کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ناول مغربی ادب کے اثرات سے وجود میں آیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں لیکن کہانی کے ذریعے زندگی کی عکاسی کرنا دونوں اصناف میں مشترک معلوم ہوتا ہے، داستان روزمرہ زندگی سے مختلف ہوتی ہے جس میں تحیّر اور انبساط کی ایسی دنیا آباد ہوتی ہے جو صرف خوابوں میں ہی دیکھی جا سکتی ہے اور ہماری ناآسودہ اور نارسیدہ خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ نہیں اس کے برعکس ناول ایک حقیقی زندگی کی طرز فکر بود و باش کی تصویر پیش کرتی ہے جس کے کردار جیتے جاگتے اور اسی ماحول میں دیکھے جا سکتے نہیں لیکن اس میں داستان کے کچھ عناصر برقرار رکھے گئے ہیں۔

دراصل ناول کی ابتدا بورژوا ماحول میں ہوئی ہے اور اسی معاشرت کی پیداوار ہے جس نے واقعات کو خیال کی دنیا سے نکال کر زندہ کرداروں کے روپ میں پیش کیا یورپ میں رابنسن کروسو نے قدیم داستانوی روایت سے بغاوت کی اور نئے واقعات اور ماحول سے متعلق چیزوں کی مادی وقعت کا تعین کہانیوں میں ظاہر کیا اور رفتہ رفتہ اس تغیر پذیر ماحول میں رومانی فکر ناول کے سانچے میں ڈھلنے لگی اور تخیلی زندگی پر

واقعیت غالب آگئے اور نیکی اور بدی کی جہتوں کا تعین پیش کیا جانے لگا۔

ناول کے لئے ایک مخصوص ماحول کی ضرورت مشاھدے کے باعث محسوس کی جانے لگی تولیدی قوتوں کی بہتات کا آپس میں تضاد، مفادات کا تصادم، سماجی اخلاقی اور اقتصادی معاملات میں غیر مساویانہ اور ناروا سلوک، قتل وغارت گری، جرائم میں اضافہ، تجارت وصنعت میں حرص اور غبن کا رجحان، پیشہ ورانہ رقابت توھم پرستی، ظلم وستم، فحاشی جنسی ناھمواری، بے ایمانی، دھوکہ اور بے اعتمادی یہاں تک کہ میاں بیوی کے علاوہ تمام انسانی رشتوں کے درمیان بے وفائی کا ایک مستقل رجحان ناول کی کہانیوں کے لئے ایک ظاھری وسیلے کے طور پر جزو لاینفک تسلیم کیا گیا اور ایسے ہی رویوں سے رونما ہونے والے واقعات اور کریکٹر اس صنف کے لئے ایک ضروری عنصر قرار پایا جس پر جدید داستان کی عمارت کھڑی ہوگئی

برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ساتھ یورپی ادب کے اثرات دوسری زبانوں پر پڑنے لگے اور ناول بھی اسی زبان میں متعارف ہوا پہلی دفعہ بہت سے انگریزی ناولوں کا ترجمہ بنگالی زبان میں ہوا اس کے بعد اردو میں ڈپٹی نذیر احمد نے انگریزی ناولوں سے متاثر ہوکر توبتہ النصوح مراۃ العروس، تبات النعش اور دیگر ناول تحریر کئے ارسال الذکر دو ناول FAMNILY INSFRNATR اور HISFORY GANDFORD انمیں سے پہلے ۲ ناولوں کا ماخذ انگریزی سے ہے ان ناولوں میں معاشرتی مسائل کے علاوہ مقامی ماحول کی بھی عکاسی کی گئی ہے اور تقریبا تمام ناول زور وشور سے تلقین اور واعظ کے فرائض انجام دیتے ہے انہی حالات میں پشتو زبان میں بھی ناول اور دیگر اصناف لکھنے کا رواج شروع ہوا اور اردو کے شانہ بشانہ قدم آگے بڑھانے لگی اور ترجمہ کے ذریعے ناول سے روشناس ہوا۔

میاں حبیب گل کاکاخیل نے پہلی دفعہ نذیر احمد کا ناول مراۃ العروس کو پشتو کا جامہ پہنایا اور نقش نگین کے نام سے پیش کیا اس ناول میں دو مولویوں کا گھریلو

تنازعہ زیر بحث ہے اور اخلاقی معیاروں پر نیکی اور بدی کی تضادات ہوتی ہے اور عیاشی کی حوصلہ شکنی مطلوب ہے اس کے بعد میاں محمد یوسف نے توبۃ النصوح کا ترجمہ کیا ان ترجموں کے بعد پشتون ادیبوں نے براہ راست ناول نگاری کی طرف توجہ کی لیکن وہی فنی ساخت اور اخلاقی معیار کو پیش نظر رکھا جو اردو ناول سے ورثے میں ملا تھا۔

پشتو میں پہلی دفعہ ۱۹۰۹ء میں راحت زاخیلی نے ناول لکھا جو نتیجہ عشق یا قصہ ماہ رخ کے نام سے موسوم ہے یہ ناول پلاٹ اور کرداروں کی خامیوں کے پیش نظر اس کو پشتو ادب کے ناقدین اگلے وقتوں کی رومانی داستانوں کی ایک منشور کڑی سمجھتے ہیں تاہم اسے اسی نئی صنف ادب کی جانب ایک اہم قدم کہا جا سکتا ہے۔ ناول کی کہانی کا سبک طویل افسانہ یا داستان کی طرح ہے لیکن چند فنی بے قاعدگیوں کے باوجود اس میں زبان و بیان کی خوبیاں کبھی ہیں۔ یہ ناول پشتو رومانی داستان طالب جان اور گل بشرہ کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے مگر مکالمے اور منظر نگاری کے اعتبار سے ایک دلکش پیرایہ اپنایا ہے جو ناول کے طرز تحریر کے قریب ہے۔ پشتو اقتباس ملاحظہ ہو

خیر شو مرہ چہ صفت کوم جوش می زیاتیږی دلیدو او نہ لیدو ډیر فرق دے۔ غرض دا دے چہ دیو شریف خاندان دلوئی کور معتبرہ جینۍ دخوار لسو کلو داسی بے وختہ ځنګه بهر راغلے دہ۔ دو مرہ قدر ویلے شم چہ موسم دسپرلی دے نرہ غولولو دپارہ راغلے بہ وی۔ دو نجی سیل کول دستر پہ سبب مشکل دے دخو یو داسی ځائے دے چہ دلتہ نجی نوری هم دا و بوږ وله یا رہ راځی دے هم دا بهانہ کړی دہ۔ لہ خیلی خدمت کاری نہ ئے پټ منګئ راخستے دے مګر بے مرګری ولاړہ دہ۔ دا خو روانہ شوہ رهټ ګرز ولوته ورانده شوہ پیشا ید لہ دے ځوانہ وشرمیږہ ورو ستور ستو پہ ګو شو د ستر ګو کښے ځوان تہ ګوری داسی معلومیږی

چہ یوہ تہو تہ زرہ ئے دھلک سرہ دے ھلک ھم عجیبہ صورت شمشاد قدم سیم اوصاف، کوتہ واسکتہ اغوستی زما دنظر لاندی چرتہ لیدلے سرے معلومیدی پہ طرف دجیینی حُسن حُسن اوار مان سرہ گوری جیینی پہ زرہ کبنے وائی۔

پہ وراندی ځم پہ وروستو گورم قدیمہ خدایہ د زرہ سرمی پاتہ شونہ

راحت کی ناول نگاری میں نذیر احمد کی طرح اصلاحی اور تبلیغی پہلو غالب نہیں بلکہ داستان سرائی دکھائی دیتی ہے جو اخلاقی حدود وقیود کے باوجود شمس النظر اور ماہ رخ محبت کی آگ میں جلتے نہیں مگر ایسی تخیلی کہانی موجودہ زمانے میں اگرچہ تصور نہیں کیا گیا لیکن بعض اوقات اس کی مثالیں ملتی نہیں۔ شاید اس کا سبب یہی ہو کہ اس وقت ایسے کرداروں کے تخلیق کا متبادل طرز فکر جاری نہیں تھا۔ بیسوی صدی کے وسط میں صنعتوں کا قیام ہوا، دو متضاد قوتیں کارخانہ دار اور مزدور وجود میں آئیں سرمایے کی دوڑ نے طبقاتی کشمکش کو جنم دیا اس تضاد اور تصادم کے زیر اثر نئے واقعات نے حالات کی عکاسی کی اور نئے کردار جو زندگی کے مسائل سے قریب تر تھے ناول میں در آئے اور متقاضی راہ ہموار ہونے لگی اور حکایتی ادب میں ناول کے فنی تقاضوں کے مطابق پلاٹ تلاش کرنے کا عمل جاری ہو گیا۔

اس وقت پشتو ادب میں ڈرامے کی صنف نے بہت ترقی کی کئی ڈرامے اسٹیج بھی ہوئے اور ادب کے وسیع ابلاغ کے لئے اسی کو اہمیت دی گئی جس کے نتیجے میں ناول لکھنے کا عمل کم ہوا اس دوران جتنے ناول لکھے گئے وہ زیادہ تر ڈرامے کے زیر اثر رہے۔ قاضی رحیم اللہ کی نئی روشنی (نوے روشنی) جو بیسوی صدی کی ربیع الاول میں لکھی گئی خاص اہمیت کی حامل ہے جس میں ناول اور ڈرامے کی مشترک خصوصیات ملتی ہیں۔ صاحبزادہ ادریس کا دوشیزہ (پیغلہ)، اشرف درانی کا چکوری آنکھیں (زرگی سترگی) اور امیر حمزہ شنواری کا نئی لہریں (نوی څپے) کردار نگاری اور مقصدیت

کی رو سے مختلف محسوس ہوتے ہیں ان کا مقصدی پہلو کرداروں کو جاندار بنانے میں معاون ثابت ہوا ہے نیا پشتون (نوے پښتون) خارجی ماحول کی صحیح عکاسی کرتا ہے رشید علی دھقان کا دسرو تعویذ (سونے کا تعویذ) ڈرامے کی شکل اختیار کر گیا ہے اور اس خامی کی بنا پر نقادوں کو اسے ڈرامہ لکھنے میں کوئی شبہ نہیں تاہم مکالمہ نگاری کی رو سے دلکش ہے۔ تحریم الحق کا کاخیل روغ لیونئے کے دو ناول حیرسی او دزپا گل پکار لیونی چیغہ ماہنامہ رہبر اور جمہوریت میں قسط وار چھپتے رہے جن میں معاشرتی مسائل کے تعمیری پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے اور ہماری معاشرت کے گندہ کرداروں کا مضحکہ اڑایا ہے اس وقت دو اچھے ناولوں کا اضافہ ہوا جن میں شیر زمان گمجن کا امانت اور ماٹو خان کا (لوٹا ہوا آئینہ) چاؤدی شیشہ میں ناول کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ماٹو خان نے اگرچہ فنی اصولوں سے انحراف کیا ہے لیکن ان میں موجودہ زندگی جھلکتی ہے اور پہلی دفعہ اچھی کردار نگاری کے نمونے پیش کئے ہیں۔ امانت میں نواب اور مزارع کے تصادم کو خوبصورتی سے پیش کیا جس میں بورژوا کے تغیر پذیر روابط کو بتدریج ظاہر کرنے کی کوشش ہے لوٹا ہوا آئینہ میں اس امریکن کمپنی کی عیاشی اور فحاشی کی تصویر کشی کی ہے جو پشاور میں قیام پذیر تھی۔ شیر زمان کے تین اور ناول گل خان، ترپور، رحمانہ کوروننہ (رحمان بستی) بھی مشہور ہیں۔ ماٹو خان کا "انتظار" اور دا یرے ادھیرے) "خاک و قبرستان" بھی قابل ستائش ہیں۔ شیر زمان اور ماٹو خان نے منظم اور مربوط شکل میں پشتو ناول لکھے ہیں اور پہلی دفعہ ان کی کوشش کامیاب معلوم ہوتی ہے۔ شبنم نے "ساس اور بہو" (خوا بنے او نزوور) کے نام سے ناول لکھا ہے جس میں معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا۔ بعد میں چند اور ناولوں کی خبر ملتی ہے۔ مثلاً سرفراز خان عقاب کا "بڑے بوٹ" (لوئ بوٹان) محمد نواز "شوم" امیر ساغر آپریدی کا "نئی نسل" (نوے کہول) دساران سرجو حقیقت نگاری سے ہرا نہیں لیکن پلاٹ کا ڈھیلا پن جھلکتا ہے۔

نور محمد ترہ کئی نے پشتو ناول کے صنف کو بہت آگے بڑھایا۔ وہ بنیادی طور پر

ناول نولیس ہیں کرداروں کی تخلیق اور منظم پلاٹ پیش کرنے میں ان کا کوئی ہمسر نہیں مکالمہ کا انداز اور زبان کی روانی کو موثر پیرائے میں پیش کیا ہے ان کے تمام ناول معاشرتی اور طبقاتی قدروں کے گرد گھومتے ہیں جیتے جاگتے کردار اور مکالموں کا عمومی سلیقہ خوبصورت منظر نگاری کے ساتھ ان کے ناولوں میں ملتا ہے ان کے یہاں دیہاتی زندگی سماجی مسائل کا اظہار اور اقتصادی ناہمواری سے رونما ہونے والے معاشرتی مسائل کی مکمل عکاسی پیش کی گئی ہے۔

"سبا د پوونده وکړې راغلې په لوئ سړک باندې تېر يدلې، سپي وسپري او ښان او خره سره ګډ وو۔ ناروغه سپين سرى ښځې او سپين ږيري دا وښانو په بارو کښې سپاره او یا ئې ترلي دي. کوچنيان ئې هم دا وښانو د بارو په سر کښې ترلي دي یوه خوا لوبه ځوږه ده شوک مخاندې شوک ژاړي۔ ځينو ښځو او یا نجونو خپلې موچنې په سر باندې ایښې دي لوڅې پښې دروې۔ شوک اصلاً موچنې نه لري او د پښو چاودې ئې له ورايه معلومېږي"

دیہاتی زندگی میں ملک کا جابرانہ رول، ایک جھلک ملاحظہ ہو:"

هنګ وروته مرغې کوږ ښولې او په خوا اشر غونګې خو په ژور ږغ ئې ورته وويل چه ته مومورا و پوره ئې۔ هر څه چه ته کوے او کول دې موږ ټول ته نه درتلو۔ خو دا چه زموږ دوے لنګی وزے چه زموږ لو غږه وه بو تلے او موږ دې په وچ حلق پرېښودلو، ستر ديره پوری به مو هېر نه سي څکه چه ټول دوبئ موږ له نوره کوره څه شلو به راوړلے او نو دوخه مو په خوا زحمت سره ستيره کړه۔ هيلړه چه دسې حال ــ په مينه خوار يجاوا ئو م او دومره به وګټم چه ستا غاری پرے وباسم۔ د ده چه خپله خبره ختله صوله د ملک ناظر پرے

رامنده کړل او غونبستل یې چه دده د دے بے ادبی نتیجه په لاس ورکړی او پر ځ یې په ځبیره ووهی خو ملک ورته وویل چه د دے سپین سترګی قصور به هغه وخت ورځنې اخلو چه دے له مسافرئ نه بیرته کور ته راوګرځی او س خه مه ورته وایه ځکه چه په مسافرئ ځی او بیا به یې هټول وخت په خواشینی تیر یږی زه خو هم داسی بے رحمه سړے نه یم دمال غل به یې یم مګر د سړی بے ځیری خو یې نه غواړم ځکه چه داهم ددوئ برکت دئ چه غنم می په خونو کښی نه ځائیږی او علاقه دار او حاکم راته په درنه سترګه ګوری. هلک د دے یوه خبره یې وکړه ودی کړی په سړیلی به د غوږ و پیچ ورکړو. ملک آس ته پونده ورکړه او په داسی حال کښی چه غنچینه یې په هوا و شوه وله سترګو پناه شو.

بنگ کا سفر، سپین، سنگسار میں دیہاتی اور شہری زندگی کے جامد کرداروں کی بھرپور تصویر موجود ہے جس میں پلاٹ خط مستقیم کی طرح قائم ہے توہم پرستی نوابوں اور خوانین کے ظلم وستم غلط رسومات پر گہرا طنز اور مہذب زندگی گزارنے کی ترغیب نہایت دلکش ہیں۔

بے تربیت بیٹیاں بزگر کی لڑکی اور ربیل کی لاندی) میں پلاٹ کی ساخت کو ہنرمندی کے ساتھ پیش کر کے حقیقی ربط کی مثال قائم کی ہے یہ ناول قسطوار شائع ہوئے ہیں۔

سید رسول رسا نے چار ناول، مفرور، مامونئ، شمی اور خودکشی لکھ کر ناول نویسی کے رجحان کو بڑھا کر بقول ایوب صابر کمیت کے لحاظ سے اضافہ کیا رسا کے ناولوں میں پلاٹ ابھرے ہیں جن میں اکثر ارتقائی منازل طے کر کے نقطۂ عروج کو پہنچے ہیں مفرور میں ایک ڈاکو کی کہانی مصنف کی زبانی کرداروں کے ذریعے پیش

کر کے چند ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو ہمارے ماحول کا حصہ ہیں۔ حالانکہ رسا کے ناولوں معزور ایک شہکار کی حیثیت رکھتا ہے وہ جو کچھ پیش کرنا چاہتے تھے کرداروں کے ذریعے نہ کر سکے۔ بلکہ پلاٹ غیر موثر رہ کر ایک خیالی تصویر رہ جاتا ہے۔ مثلاً پشتون معاشرے میں ایسے کردار نہیں ملتے۔ البتہ ماحول کے تغیر پذیر عمل پر طنز ضروری ہے۔ اقتباس

دے بلی کمرے ته لاړشه هلته د ښځو جامے واچوه برقعه په سر کړه زه به د سړو جامے واچوم. دا چاقو واخله ځان سره کړه دا به له ده وهه او زه به طمانچه راواخلم. زه حیران سوم چه دا لاځه قصه ده زه د ښځو جامے واچوم او دا به د سړو خو بغیر زما تپوس ملا بوو وے. حیرانتیا مه زه چه تا چیرته بوځم هلته هم دغه دستور دے هلته هر سړے د خپلی معشوقے سره راځي او ښځو د سړو جامے اچوی او سړو د ښځو او په دا چه څوک یے ونه پیژني.

ملا بوو د بنسار په تنګو تنګو کوڅو کښے روان وه او زه ورپسی چپ چاپ خاموشه خور خطا ور حطار وان وم آخر هلته په یوه تنګه کوڅه کښے دیو درے چتیز مکان دوړاندی ودریده مکان یے وچ بولہ. یو ساعت پس دروازه نیم کشه شوه یو خطرناک سړے د دروازے په درنږ یے غلے شان وکتل او چه ملا بو یے ولیده ودیے لږی کړه ملا بو په غوږ کی څه ورته ووی سړے وړاندی شو او موږ ورپسے لاندی یو سے تهه خانے ته بوتلو هلته د خاورو دتیلو د لټینونو په رڼا کښے په رنګ تالین د پاسه زموږ په شان لس جوړے نوری هم ناستے وے. غتو غتو بالښتونو ته یے تکیه کانی

هم وهلی وے۔ سره ود ښځو او ښځو د سره وچاے اغوستے وے ګلابو زما د هغو لوسره پيش نه کړلو کړه او ورته يئے ووی۔"

ایسے واقعات ھمارے ماحول کی ترجمانی نہیں کرتے جس میں مثبت تخیل نہیں بلکہ منظر نگاری میں غیر ضروری تکلف اور حقیقت نگاری کم محسوس کی جاتی ہے ایک مکالمہ۔

داخوخان تجارت دے سوداګری ده۔ دد ے نه نه يئے خبر داجنګړه دلرې لرې ځايونو نه خلق راولی او په قسما قسم چلونو څه څوداسی وی چه چرته زيار رتو نو تر راشی لکه د پیغوز یارت نه یاداسی نور۔ او دهغه ځائے نه يئے څوک په تکی برګی دکوهاټ درے ته راولی او په دره کښے يئے په سوداګر وخرڅی کړی او سوداګر وخرڅی کړی او څينی په کلو کښے داغی سی یا بدنامه سی او مور وپلار او خپل خپلوان ئے دوړلو په ځائے په چا خرڅی کړی۔

رسا نے پشتون معاشرت کے چند ایسے کرداروں کو اصلاحی نیت سے پیش کیا ہم اس معاشرے میں گلابو اور رعری جیسے کرداروں سے قطعاً انکار نہیں کر سکتے لیکن رسا کو فنی اعتبار سے پلاٹ کی ساخت کا سلیقہ نہیں۔ بعض مکالمے توجہ طلب ھیں گلابو انٹرویو کے دوران کہتی ہے۔

شاباسے ځوانه! اوس په ژوند پوه سوے د ملایانو په خبرو پسی مه څه ملا بد څه وی او خبری بد يئے څه وی۔ بر تو غابن په لاس تهوله ورځ او دس وچوی۔ او په وظيفو، صدقو او خير اتونو پائی۔ او آخرت ستائی او دنيائے و نورو خلقو ته پريږدی۔ زه څو وايم چه هغه بد څه بے غیرته پښتون وی چه قبر ته کوزیدو سره منکر نکير پرے بے تپوسه راکښيږ نه دی۔ پښتون له پکار

دی چه هر څه شی خو یو ملاند شی او د خلقو د خندا نه شی
او چه مړ شی چه ښخی ور پسې په ژړا کېنې داونه وائی. چه ...
ستړې وو. نه چا په ښو کېنې وو. او نه چا په بدو کېنې وو او د چا
ملا ستړه غوییئ بې همه نه پاسولې."""

او چه ملاشی نو د پښتو او د خانئ کار ته بلاشی هر وخت آخرت
آخرت ژاړی او د دنیا ور نه پاتې شی. ښه کار کوی او بد مه کوی. دا
د ملایانو خبری دی او د وئ په د غه کېنې ژوند تیروی. دا ښه دا
بد. دا ښه دا بد لا ژوند کېنې چار او ستی دی.

گلابو ایک اور جگہ کہتی ہے۔

نوکری څه شے دے. دا خو د ښو کمارو کار دے. د هوا
مار خان د مرداری رزق او د پنجرے آب و دانه کله خوښوی. باز نه
جاله جوړوی او نه مرداره خوری. خو چه بنیادم نوکر شی نو د
باز نه تهیښ لشی د مرداری رزق بے روزی شی او بیا د هوا د مرغانو
په ... د کور ... چرگ کوړو ښکار کوی. ته نوکری کوه. خره ستړگی
کړے جاے ... آئینه کېنې ستړگی اړوه او ډول سر نا سره ...
کوه او که یره او یا د چا افسر تالی ځنته او تالئ مینځه د غه کار تا ته
ښه د ے ...

... نے اس کہانی میں اپنے مشاہدے کے بجائے مجرمانہ حالات سے
دوچار کرداروں کو تخلیقی بنیاد پر پیش کیا جن میں قدم قدم پر ہٹ دھرمی کے علاوہ
احساسِ ندامت بھی موجود ہے اور ان میں مہذب زندگی گزارنے کے لئے فطری
اعلان کا احساس ہوتا ہے۔ عمری جیل میں اپنی کہانی سناتا ہے۔

... ما گلابو ته و وے آخر موږ بد ترکوی دا سے ژوند تیروو

د بدکار انجام بد وي د ليوني سپي عمر کم وي۔ يوه ورځ به يا ژوندي او نيولی سو يا مو به خوک لوولي نښه به داوي چه دا ژوند پر ېين دواو کراچي ته لاړ شو هلته به موږ نوے ژوند شروع کړو په بندرونو او تاپوانو کښے مزدوري ده يري وي ازه به مزدوري کوم او د واړه به غريبي خو ديانتداری ژوند تير وو۔ توبه استغفار به شوئ

رسول رسّا نے مکالموں کے ذریعے کہانی کو جانبدار بنایا ہے، ماموني سفر ایران کی ایک روئداد ہے ایک عام کہانی کو مشاہدے کے زور سے مربوط بنایا ہے اور آزادانہ ماحول کی منظر کشی کی ہے شمی اور خودکشی میں کردار جامد اور محدود حلقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

میاں مکمل شاہ کا ناول ژوندئ مینہ (زندہ محبت) میں ایسی کہانی ہے جس میں ایک بچی کی پرورش کا ماں کی غیر موجودگی میں والد نے ذمہ لیا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس بچی کو معاشرے میں وہ مقام ملتا ہے جسے ماں نے تربیت دی ہو۔ پلاٹ بیانیہ انداز کا متحمل ہے جس کی دم سے کردار ڈھیلے لگتے ہیں۔ محمد موسیٰ محتاج نے "وہ میں ہی تھا"، "برطانوی لڑکی" لکھے ہیں جو سرگزشت کی صورت میں ہے۔ شیر محمد خان کا پیمان (لوظ) لیونئ مینہ (پاگل محبت) میں نفسیاتی الجھنوں کا خاکہ ملتا ہے۔

ہمارے یہاں ایک غلط روایت یہ بھی قائم ہے کہ ناول کا خاکہ ذہن میں تیار کر کے تحریر سے قبل ہی اس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ جبکہ ایسی ناولوں کا نام ونشان کہیں نہیں ملتا ممکن ہے بعض ادیبوں کے پاس مسودات موجود ہوں لیکن زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکے یہاں چند ایسے ناولوں کا تذکرہ ضروری ہے کہ آیا وہ خیالی ہیں یا محض مقالوں کی زینت بن چکے ہیں مثلاً دوآنیز (دو آنے) اور صبر پریشان خٹک۔ عجب خان آپریدی، ایوب صابر، پیغلہ (دوشیزہ)، عبدالوہاب

دستی، حیرانئ سعید گوہر، ملک عثمان خاورین کا ایک نامعلوم ہیجان خیز ناول بشمول ماکئ، مقالہ نگاروں نے شد و مد سے تذکرہ کیا ہے، اس کے علاوہ ڈاکٹر خدائیداد اور کمال خان شیرانی سے انگریزی ناولوں کے ترجمے منسوب ہیں، دوشیزہ فرانس کا ترجمہ عطاءاللہ کاکاخیل نے کیا ہے اور فولاد کیسے مضبوط ہوتا رہا، اور مار کے ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں کبرا مظلوی نے چاند "سپوږمئ" کے نام سے ایک خوبصورت ناول تحریر کیا ہے جس میں عورتوں کی بے بسی اور معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کو بے نقاب کیا ہے اور ظالم معاشرے کے جبر او توہم کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بیانیہ انداز تمام مکالموں میں جھلکتا ہے۔ اقتباس۔

زه پوهیږم چه ولې دی خلکو ته د ښځو ژوند او حق ټوکی او مسخری ښکاری او د غه معصومه طبقه د خپلو شهوانی عزیزو آله او د خپلی ساعتیری کوډه اکی بولی۔ هو دا ځکه چه په اجتماع کښې سړے قدرت لری او ښځو حقوق لاتر او سره پېژندل شوی نه دی۔ همدا غلط قضاوتونه او هوسی عشقونه دی چه د یو زیات تعداد ښځو د بدبختئ سوب ګرځی۔ همدا قدرت دے چه ډیری پاکی نجونی چه په خپلو پاکو زړونو کښې سل رنګه امیدونه لری خودکشئ یا انحراف ته مجبور شی۔

"بُنزے" (سوتیلا لڑکا) بزن کے ایس غازی سیال کا ایک تازہ کامیاب ناول اس سال چھپ چکا ہے۔ جو ہر لحاظ سے اچھی کوشش ہے۔ ہمارے معاشرے کے زندہ کرداروں کو خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ ماں کی محبت۔ ایفائے عہد اور ناموس کی خاطر قربانی کا احساس پشتون کریکٹر کا طرہ امتیاز ہے۔ غازی سیال نے ایک عام کہانی کو ایک بھرپور تاثر کے ساتھ مصوری کی صورت دی اور ماحول کی خوبصورت عکاسی ان کے شاعر دماغ کا کرشمہ ہے۔ کہانی کا کلائمکس ملاحظہ ہو۔

سلیم نا امیده سو او خیال یې کولو چه نن خو جمعه ده د چیټۍ ورځ ده. نن خو به داجی ته تله ورځ بهروی خوداد مومی سره دومره اوږدے خبری به تیلی فون څوک کړی. مومی اگر که داسې نه وه ولے هغه چه وائی به بنځه او ته ده اعتبار کول نا پوهی ده. انسان به لیږی مومی خوهم ځوانه ده. هم ځوانی جذبے لری او داجی خو اوس لږ بوډا غونډی دے دا قسم اندیښنو به مخه کړو. قسم قسم شبهات او خیالات یې په زړه کښې تیریدل او راتیریدل د سوځو به دا غوبل کښې هغه په فضا کښې کتل شروع کړل او لری یې ولیدل چه پلار یې ولاړ دے او مخ یې په دواړ ولاسو پټ کړے دے.

غازی سیال نے سلیم اور جلال اور فہد کے کرداروں کی صحیح ترتیب اور تنظیم کا خیال رکھا ہے۔ پلاٹ دلچسپ اور تیز دار محسوس ہوتا ہے۔

پشتو ناولوں میں پلاٹ میں اب زندگی چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے اور اپنا اپنا چہرہ دکھائی دیتا ہے یکسانیت کا احساس جب کبھی ہوتا تھا کہ کہانی بدمعاش کی مداخلت سے شروع ہو کر لڑکے لڑکی کی محبت اور وفاداری کے ساتھ بدمعاش کی موت پر منتج ہوتی تھی اس کے علاوہ "کونډه" "بیوه" خان جیسے کردار اب بھی ملتے ھیں۔ مگر توہم پرستی کی روایتی بدبختی اب تقریباً ختم ہو چکی ہے روایتی ڈاکو قاتل ظالم، منافع خور معاشرے میں مختلف لبادے اوڑھے ہوئے اب بھی ملتے ہیں مگر ناول نگاروں کے پختہ شعور نے مثبت اور منفی کرداروں کا احاطہ کر کے تعمیری اور اصلاحی پہلوؤں کو ابھارا ہے اور اپنے معاشرے کی مصوری کا مکمل ادراک رکھتے نفسیاتی، سماجی اور اقتصادی مسائل کے ابھار کے لئے ناول ہی ایک حقیقت پسندانہ وسیلہ ہے جس میں ہر کریکٹر شفاف دکھائی دیتا ہے اور بجا طور پر چند ناولوں کو معیار سمجھ کر یہ دعوہ کیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ مسائل اور پیچیدگیوں

کے ابھارنے کے لیئے یہ صنف ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے تاہم ناول نگاروں کی نفسیاتی بصیرت کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے اور اس صنف کی طرف عدم توجہ کی وجہ بقول محمد اجمل کے کچھ تو تعلیم یافتہ طبقہ اپنی زبان اور اس کی ادبی کتابوں سے بے توجہی اور کچھ اہل قلم کی تنگ دستی اس صنف کی خاطر خواہ ترقی میں مانع ہے اس کے باوجود پشتو ناول نے کئی تجربات سے نکل کر اب ایک صحیح نہج کی نشاندہی کی ہے جس کے ذریعے اس صنف کی فنی اور مقصدی پہلوؤں کے امکانات کا مناسب تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

فضل احمد غازی

امیر خسرو

پاکستان کے علم و فن کا مظہر

ابھی چند ماہ قبل کابل میں حضرت امیر خسرو پر ایک مذاکرے کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا گیا تھا۔ ہر مقرر اور مقالہ نگار نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ:

"این نابغۂ روزگار بلخی بود، و بلخ در افغانستان واقع است۔"

پھر ہندوستان نے، دہلی میں چند دانشوروں کو اکٹھا کیا اور مذکورہ حضرات نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حضرت امیر خسرو دہلوی تھے۔" میں اس بحث میں شامل نہیں ہونا چاہتا اور نہ حضرت امیر خسرو کے آبائی وطن خطے اور نسلی حیثیت کے بیان سے آپکا وقت لونگا۔ اس لیئے کہ میں تحریک آزادی، پاکستان کے ایک گم نام سپاہی کی حیثیت سے، ایک نظریاتی ورثہ رکھتا ہوں۔ وہ ورثہ جسے ذرعام میں نظریہ پاکستان کا نام دیا گیا ہے۔ اور نہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت سعدی کے آباؤ اجداد کا تعلق بلوچستان سے تھا۔ کیونکہ انکی دو مشہور کتابیں، بوستان اور گلستان بلوچستان کے دو مشہور خطوں، یعنی بوستان اور گلستان کے ناموں سے منسوب ہیں ایسی سرگرمیوں سے ایک نظریاتی وطن کے باشندے کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی ہے ہم تو وہ ہیں کہ ملت اسلامیہ کے ہر سربلند نابغہ کو، تمام مسلمانان عالم کا ایک مشترکہ سرمایہ تصور کرتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت امیر خسرو جیسے سربلند انسان جغرافیائی جکڑ کاٹے اور فریم میں بند نہیں ہو سکتے۔ اسی لیئے تو خدا کے ان برگزیدہ بندوں

کا نام صد ہا سال کے گزر جانے کے باوجود روشن اور تابان ہیں۔ یہ تو وہ ھیں جبکا کہ ابتداء سے یہ مشترکہ نعرہ رہا ہے کہ :-

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

لیکن اسکا مطلب یہ بھی تو نہیں کہ ہم خود فراموش بن جائیں۔ آپ جانتے ھیں کہ خوشحال خان، پاکستان کا وہ گراں مایہ سرمایہ ھیں جنہوں نے قلم اور تلوار کے ذریعے تاریخ کی جبیں پر عظمت و جلال کے نشانات مثبت کئے۔ لیکن ہم نے انکو ایسے فراموش اور صرف نظر کر دیا جیسے کہ علاقائیت انکا تخلیقی نعرہ ہو۔ اب تک افغانستان خوشحال خان پر دو بین الاقوامی سیمینار منعقد کرا چکی ہے۔ ان دونوں اجتماعات میں یاروں نے یہ تاثر دینے کی کامیاب کوشش کی کہ خوشحال خان ایک قوم پرست شاعر تھے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ مغلیہ حکومت کے ساتھ، انہوں نے کیوں تعاون کیا، پھر کیوں لڑے اور آخر کار پھر کیوں اتحادی بنے ؟

ایک رات کابل کے سرکاری مہمان خانے میں خوشحال خان کے سیمینار کے اور غیر ملکی مندوب نے مجھ سے استفسار کیا کہ خوشحال خان کی قبر، افغانستان کے کس حصے میں ہے ؟ جب میں نے انہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا تو اسکی جبین پر شکن کے آثار ہویدا ہوئے۔ میز پر سے اپنے جام کو اٹھا کر خالی کر دیا اور پھر کہنے لگا "تم پاکستانی بہت خود فراموش ہو، اپنے ملک کے اکثر شاہراؤں کو تو ان کے ناموں سے منسوب کیا ہے جو ملکہ وکٹوریہ کے قصیدے لکھا کرتا تھا۔ اور برصغیر کی پہلی جنگ آزادی کے قائدین کو نمک حرام، خبیث اور بے حیا تصور کرتا تھا اور وہ جو واقعی تمہارے ساتھی تھے اور جنہوں نے اپنی تمام عمریں تمہارے ملک اور لوگوں کی خدمت میں گزار دیں، انکو فراموش کیا۔"

یقین جانیئے کہ میرے پاس اس مرد دانا کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لئے ایک زہر خند کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اپنے اپنے کمروں کی راہ لی

میں تمام رات سوچتا رہا یہ کتنا ظلم اور خود فراموشی ہے کہ آج تک ہم نے کسی بھی نتیجہ خیز کوشش کے ذریعے دنیا والوں کو اپنے ملک کے علم وعرفان کے سرچشموں سے آگاہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس خود فراموشی کا آج یہ نتیجہ ظاہر ہوا ہے کہ اگر آپ شاہ لطیف، بلھے شاہ، عبدالرحمان، عبدالعلی، جام درک اور محمد عمر کے بارے میں نسل نو سے کوئی سوال کریں تو انکے چہروں پر سوالیہ نشانات پیدا ہوں گے آپ بھی حیران ہوں گے کہ یہ عجیب بے عنوان انسان ہے؟ اس کا عنوان کیا ہے اور یہ بول کیا رہا ہے؟ اجتماعی خود فراموشی کی عادت نے مجھے مجبور کر دیا کہ امیر خسرو کے حوالے سے آپکی توجہ ایک اہم مسئلے کیطرف مبذول کراؤں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسکی اہمیت سے اہل سیاست شاید بے خبر ہوں اس لئے چاہتا ہوں کہ ہم اور آپ اس طرف توجہ دیں کیونکہ یہ پورے پاکستان کے علم وعرفان اور ملی تشخص کا مسئلہ ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ ہم صحرائی اور کوہستانی غالب کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ ہمیں عزیز ہیں اپنے اعمال کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنی اردو شاعری کی وجہ سے لیکن اسکا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ اپنی شاہراؤں کو ان کے نام الاٹ کر کے ان سربلند انسانوں کو فراموش کریں جنہوں نے قلم یا تلوار کے ذریعے استعمار اور استعماری نظام کے خلاف جدوجہد کی ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پہلے ان حضرات کو اپنے عوام سے روشناس کرائیں جو نصف زمین بر سر زمین کے لئے کام کرتے رہے اور قربان ہوتے رہے اور جو اس سرزمین سے اس انداز سے اٹھے تھے کہ اپنے علم فن ادب اور غیرت کے کارناموں کے ذریعے استعمار کے لئے بلائے آسمانی ثابت ہوئے یہ وہ ہیں جنہوں نے ہمیں باوقار زندگی اور باعزت موت کا سلیقہ سکھایا تھا اور اپنے خون شہرگ کے ذریعے عزت و مردانگی کی تاریخ رقم کی ہے۔ اس کام کے کرنے کے بعد پھر ہمیں یہ حق حاصل ہو گا کہ نہ تنہا حضرت امیر خسرو، بلکہ پوری دنیا کے اہل دانش

کا اپنے عوام سے تعارف کرائیں اس لئے کہ دانش مومن کی میراث ہے۔

ہم عجیب لوگ ہیں جسطرح ہم نے اپنی آزادی اور آبادی کی تاریخ کو مسخ کر دیا ہے اسی طرح ہم نے حضرت امیر خسرو کی تاریخ کو بھی دیو مالائی حیثیت دے دی ہے جو جس کے جی میں آتا ہے، کہتا ہے، لکھتا ہے اور شائع کرتا ہے۔ یہ اس لئے کہ قلم بے چارہ، ایسے ہاتھوں میں آیا ہے جنہوں نے طویل عریض اور تاریخی پاکستان کے خدوخال کو محسوس ہی نہیں کیا ہے اور نہ اس کام کے لئے انکے پاس وقت ہے اور نہ خواہش۔ تبھی تو یہ کتابی کیڑے یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ قوالی حضرت امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ یہ حضرات جو ابھی تک دہلی کو نہیں بھولے اگر پاکستان کے دور افتادہ مدرسوں اور خانقاہوں کی ثقافتی اور تاریخی اقدار سے واقف ہوتے، تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ مذکورہ علاقوں حضرت امیر خسرو کی پیدائش سے بھی پہلے موسیقی کی ایک قدیم صنف آج بھی اپنے حقیقی خدوخال میں موجود ہے۔ حقیقت میں یہی صنف قوالی کی ابتدائی شکل ہے اور اس کا نام "بنڈار" ہے اسی بنڈار کو برصغیر کے بادشاہوں کے وہ مسلم لشکری جو شوقِ جہاد میں مدرسوں اور خانقاہوں سے نکلے تھے، دہلی اور اس کے گرد و نواح تک پہنچایا "بنڈار" میں بنڈارچی، ابتداء سے، مذہب گزیدہ اشعار گایا کرتے تھے، اور آج بھی اس کا یہی انداز ہے۔ بنڈارچی، جب "درت تے" پر پہنچ جاتے ہیں تب وہ تالیوں اور ساز کو تیز تر کر دیتے ہیں۔ اور بار بار "آستھائی" کو گاتے رہتے ہیں۔ اکثر بنڈارچی "دادرا" بھی کرتے ہیں۔ اس عمل کو ہمارے فنکار "پیوند دوزی" کہتے ہیں۔ یعنی بنڈارچی جو گیت گا رہے ہوتے ہیں اس میں دوسرے ہم وزن گیتوں کے اشعار کو بھی پیوند کرتے ہیں۔ لیکن "آستھائی" کے شعر میں فرق آنے نہیں دیتے۔ اور یہی مزاج قوالی کا ہے۔

جس دور میں بنڈار دہلی پہنچا تو اس وقت دہلی کے گرد و نواح کے غیر مسلموں

اس سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ دہلی کے درباروں میں جو ثقافت پروان چڑھی کے تار و پود پاکستان کے تاریخی اور جلالی خطے میں تیار ہوئے تھے پشاور سے کلکتے تک اور کوئٹہ سے دہلی تک جو تاریخی راستے وجود رکھتے ہیں اور جن پر ہماری عظمت و جلال کے پیکروں کے کاروان ؛ سے

دوڑے تھے جس انداز سے وہ جانب منزل
اٹھتا ہے غبار آج بھی اس راہ گزر سے

ان راستوں کو آپ نے کیوں فراموش کیا؟ ان تاریخی راستوں پر سے ہمارے جو قافلے دہلی کیطرف چلے تھے وہ اپنے ساتھ اس ثقافتی ورثے کو بھی لے جاتے رہے جن کا مرکز و محور خود پاکستان کے تاریخی خطے ہیں وہ خطے جہاں پر "اڑپہ" "موہن جو دڑو" اور "دہار" واقع ہے۔

اسی لئے تو کہتا ہوں کہ بھول جائیے دہلی کو اور اسکے ان درباروں کو جس نے ہمارے آبا و اجداد اور انکی اولاد کو اپنی گرم آب و ہوا اور عیش و آرام سے اتنا نرم و نازک اور کبک رفتار بنا دیا کہ صرف شعر گوئی اور مرثیہ نویسی تک محدود ہو کر رہ گئے باد شاہ، شاعر کاسہ لیس اور کاسہ لیس وزیر بن گئے۔ اور سپاہی تلوار چھوڑ کر تالیاں بجانے لگے۔ اپنے ہی وطن پاکستان کے عظیم تاریخی کھنڈرات اور آبادیوں میں اُن موتیوں کو تلاش کیجیے جو خود ہماری اپنی غفلت اور لاپرواہی کے باعث غیروں کے کھاتوں میں لکھے جا چکے ہیں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خود پاکستان ہماری حقیقی ثقافت کے تجرباتی فنون کا سرچشمہ ہے۔

علم فن، عرفان اور حضرت امیر خسرو کے ساتھ مشہور و معروف سرود نواز استاد امجد علی خان ہندوستان بہت فخر کے ساتھ مشہور و معروف سرود نواز استاد امجد علی خان کو جو اپنے فن میں بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں دنیا والوں کے سامنے اپنے نمائندے کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن کیا وہ اس تاریخی حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ استاد امجد علی خان کے آباؤ اجداد پاکستان صوبہ سرحد کے کوہاٹ علاقہ سے دہلی دربار

میں پہنچے تھے؟ یہ وہی گھرانہ ہے جس نے رباب میں ترمیم کر کے سرود کے نام سے ایک نیا ساز ایجاد کیا۔

ہم بار بار سن اور پڑھ چکے ہیں کہ حضرت امیر خسرو نے ایرانی سازوں اور راگوں سے بھی کافی استفادہ کیا ہے آئیے ذرا یہ بھی دیکھیں کہ خود ایرانی سازوں اور راگوں کی تاریخ کیا ہے؟ ایران کے ایک مشہور و معروف مورخ آقائے مہندس محمد علی بخذ "بلوچستان" کے عنوان سے اپنے ایک سلسلہ وار مضمون میں لکھتے ھیں:۔

در تاریخ بابل نام اقوام کاسی یا کوش و بہ اصطلاح مورخین یونان کیسان کوسان ہم بسیار بردہ شدہ۔ در کتاب "مجمل التواریخ والقصص" در ذیل پادشاہی بہرام گور می نویسد:۔ وکس را ہیچ رنج و ستوہ نیافت جز آنکہ مردمان بے رامشگر، شراب خوردندی۔ پس فرمود تا بہ ملک ہندوان نامہ نوشتند۔ وازدے کوسان خواستند وکوسان، بہ زبان پہلوی خنیساگر بود۔ پس از ہندوان دوازدہ ہزار مطرب بیامدنند، زن و مرد، لوریان کہ ہنوز بجا ہند"۔

اب اگر آپ مذکورہ ایرانی مورخ کے مذکورہ تاریخی حوالے کی روشنی میں "کاسی" اور "لوری" کے خطے کی تحقیق کریں تو آپکو معلوم ہوگا کہ پاکستان کے کوہ سلیمان کا پرانا تاریخی نام "کیسا" ہے بعض کتابوں میں اسے "کسے" کے نام سے بھی یاد کیا ہے زمانہ قبل از تاریخ سے اس خطے کے باشندوں کو "کاسی" کا نام ملا ہے۔ "کاسیان" کاسی کا جمع ہے۔ یونان والوں نے "کیسا" کی مناسبت سے اس خطے کے باشندوں کو "کیسان" کے نام سے یاد کیا ہے اس تاریخی قبیلے کے ہزاروں افراد اب بھی کوئٹہ میں آباد ھیں۔ اور کوئٹہ میں انکے آبائی گاؤں کا نام "قلعہ کاسی" ہے۔ اس قلعے کیطرف جو راستہ جاتا ہے اس کا نام بھی کاسی شہراہ ہے بھی

حال' اس تاریخی قبیلے کے "رامشگر" یعنی سازندوں کا ہے جسے ایرانی اور یونانی مورخوں نے "لوری" کے نام سے یاد کیا ہے جسطرح ایرانیوں نے "ڑ" نہ رکھنے کے باعث "غاڑہ" کو "غارہ" بنا دیا، اس طرح انہوں نے ہمارے "لوڑی" کو "لوری" کے نام سے نوازا۔

ہندو اور ملک ہندوان پر اس لئے کچھ کہا نہیں کہتا، کہ یہ تو آپکو معلوم ہی ہے کہ ایرانی، سیاہ دش، یعنی گندمی رنگ افراد کو ہندو کہتے ھیں۔ مثلاً حافظ نے اپنے ایک شعر میں خال سیاہ کو ہندو کہا ہے:

اگر آن ترکِ شیرازی بدست آرد دل مارا
بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اور ذوق نے کہا:

خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

خیر تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ زمانۂ قبل از اسلام میں پاکستان کے "کیسا" کے خطے سے بلوچستان کے "کاسی" اور "لوڑی" قبائل کے مطرب ایران کے اپنے مورخین کے بیان کے مطابق، بہرام گور کی جشنِ تاج پوشی میں ایران پہنچے اور رقص و موسیقی کا مظاہرہ کیا۔ اس وقت ایران میں رقص و موسیقی نہیں تھی۔ تبھی تو ایرانی مورخ کو، تاریخی حوالے سے لکھنا پڑا "کہ مردمان بے رامشگر شراب خوردندی" اس کے بعد امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ایران میں ہماری موسیقی اور رقص نے نیا چولا بدلا۔ اور اس میں ایرانی حضرات نے بھی حضرت امیر خسرو کیطرح کامیاب تجربے کئے اور جب اسلامی دور آیا اور دھلی بھی ایک پرکشش اسلامی مرکز بنا تو ہمارے فنکاروں کے ذریعے ایران کے راستے بھی دہلی پہنچے۔ یہ دور حضرت امیر خسرو کا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے

کہ حضرت امیر خسرو دہلی کے گیارہ مسلم بادشاہوں کا زمانہ دیکھ چکے ہیں۔ ان گیارہ بادشاہوں میں سے حضرت امیر خسرو، ساتھ بادشاہوں کے دربار سے منسلک رہ چکے ہیں چنانچہ اس نابغہ روزگار نے اپنی جدت پسندی شوق اور ذوق کے ذریعے موسیقی کے فن میں مزید دل کشی پیدا کی جہاں تک خود ہندوستان کا تعلق ہے تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ خطہ تاریخ کے ابتدائی ادوار میں فن اور موسیقی کے لحاظ سے بہت قلاش اور مفلس تھا؟ یہ ہمارے مسلمان فنکاروں خصوصاً امیر خسرو کی کاوش اور برکت کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان اس قابل ہوا ہے کہ دوسروں کے شعار فنون اور موسیقی کے دستے باہر کی دنیا کو بھیج رہا ہے ہندوستان کی اپنی کلاسیکی موسیقی برائے نام تھی۔ ان کے پاس "یک تارہ" کی قسم کا ایک ساز تھا جسے "دنیا" کہا جاتا ہے اور دوسرا ساز "مردنگھم" تھا۔ انہی دو سازوں سے یہ لوگ موسیقی کی ایک صنف رکھتے تھے جسے "دمار" کہا جاتا تھا۔ یہ آجکل متروک ہو چکی ہے ہندوستان کے بعض خطوں کے کھنڈرات کے پتھروں پر جو پرانی تصویریں منقش ہیں ان پر ان سازوں کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔

کرشن جی کے ہوائی قصوں میں، بالنسری کا بھی ذکر ملتا ہے۔ حق کی بات تو یہ ہے کہ جب آریہ پاکستان کے خطے سے نئی چراگاہوں کی تلاش میں آگے بڑھے تو اپنے ساتھ ہمارے گلہ بانوں کے "شبیلئ" کو بھی لے گئے جو آج بھی ہمارے ہاں ماضی کیطرح مروج ہے۔ اور اسے "بالنسری" کا نام اس لئے ملا کہ آریوں نے "نے" کی بجائے اسے "بالنس" سے بنانا شروع کیا۔

ہو سکتا ہے کہ میرے قارئین محترم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ خدا نخواستہ میں اپنے ہی علاقوں کی برتری کے جذبے کی بیماری میں مبتلا ہوں ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہی میں حضرت امیر خسرو کی عظمت سے منکر ہوں بات

میں بھی اسی طرز کی ایک اور موسیقی کی صنف موجود تھی جس کا نام "کیرتن" تھا اور جب حضرت امیر خسرو کا زمانہ آیا، تو اس نابغہ روزگار نے بنڈار اور کیرتن کو سنکرانکے متزاج اور بنیاد پر جس موسیقی کو ترتیب دیا اسے قوالی کا نام ملا جہاں تک بنڈار کے ابتدائی سازوں کا تعلق ہے تو ان میں ڈھولک جسے امیر خسرو نے درمیان سے کاٹ کر طبلہ بنایا، دف، رباب، چک چکی، تالی اور گھڑا شامل تھے۔ لیکن آج امتداد زمانہ کے ساتھ اس میں بھی قوالی کیطرح مصری ساز شامل ہو گئے۔ ہمارے شاعر بنڈار کے لئے جو گیت تخلیق کرتے ھیں انکا پیمانہ اور الفاظ کی روانی کچھ اس نوعیت کی ہوتی ہے، کہ مختلف راگوں میں آسانی اور روانی سے گائے جاسکیں اور سنیئے! کہتے ھیں کہ ستار بھی امیر خسرو کا تحفہ ہے لیکن جو محقق ھمارے ثقافتی پس منظر اور اسکی تاریخ سے باخبر ھیں ان سب نے لکھا ہے کہ ستار پاکستان کے شمال مغربی علاقوں کے پہاڑی خطوں میں زمانہ قبل از تاریخ سے مروج ہے اور اگر آپ چترال اور سوات کی سیر کریں تو آپکو معلوم ہو گا کہ اب بھی وہاں ستار اپنی پرانی شکل وصورت میں موجود ہے۔ آپکو شاید معلوم ہو کہ شروع میں ستار کے تین تار ہوتے تھے۔ ایک "باج" کا تار اور دو "سُر کی جوڑی" بعد میں ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اس میں چار مزید تاروں کا اضافہ کیا گیا اور ستار سات تار کا بنا دیا گیا۔ ستار میں تبدیلی کا یہ عمل شمال مغربی خطے میں ہی عمل میں آیا اور اگر کسی کو اس کے لئے ثبوت کی ضرورت ہو تو وہ مذکورہ خطے کے ماضی کی باقیات سے بخوبی اندازہ کر سکے گا کہ سات تاروں والا ستار پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں اس وقت بھی موجود تھا جبکہ حضرت امیر خسرو کے والد مرحوم بھی پیدا نہیں ہوئے تھے اور آج بھی ماضی کیطرح چترال میں موجود ہے۔

اسی طرح ستار کے اندر "سُر کی جوڑی" کے علاوہ "پنچم" "کھرج" اور "چیکاری" کا جو اضافہ ہوا ہے۔ اور جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت

امیر خسرو کی ایجاد ہے حقائق اور تاریخی عمل کے خلاف اور برعکس ہے۔ یہ تمام حضرت امیر خسرو کی پیدائش سے قبل بھی مروج تھے البتہ حضرت امیر خسرو کی جدت پسند طبیعت نے اس میں رباب سے متاثر ہو کر چند نئے تجربے ضرور کئے مثلاً اس کا حجم بڑھا دیا۔ اور اس میں رباب کی طرح طربیں شامل کیں حضرت امیر خسرو سے قبل ستار توت یا شہتوت کی لکڑی سے بنایا جاتا تھا۔ لیکن حضرت امیر خسرو نے اس میں ایک یا دو تربیے لگائے جسکی بنیاد صدیوں پرانی چترالی ستار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ "غارہ" حضرت امیر خسرو کا ایجاد کردہ راگ ہے، کاش یہ لوگ پاکستان کے کاکڑستان خطے کے "غاڑہ" کے انداز اور تاریخ سے آگاہ ہوتے۔ کاکڑ جوان اور دوشیزائیں "غاڑہ" کے عنوان سے موسیقی کی جس صنف کے سُر میں شاعری کرتی ہیں یہ اس وقت بھی موجود تھا جبکہ حضرت امیر خسرو پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ یہی "غاڑہ" جب بہرام گور کی جشن موسیقی میں بلوچستان سے ایران پہنچا تو ایرانیوں نے اسے "غارہ" کیونکہ ان کے پاس "ڑ" نہیں ہے اور جب دہلی بھی ایک اسلامی مرکز بنا تو ایران سے ہوتے ہوئے پاکستان کے بلوچستان صوبہ کے کاکڑستان خطے کا "غاڑہ" "غارہ" بنکر دہلی پہنچا اور پھر حضرت امیر خسرو نے اسے ایک باقاعدہ راگ کے طور پر متعارف کرایا اس طرح ایک اور راگ کو حضرت امیر خسرو کے نام سے منسلک کیا گیا ہے جو "غنم" کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ یہ نام بھی خالص پشتو ہے۔ غنم پشتو میں گندم کو کہتے ہیں۔ ہمارے کاشت کار گندم کی کٹائی کے وقت ملک تشکر و عقیدت کے جذبات کے ساتھ جس سُر میں گاتے ہیں وہ "غنم لو" کے نام سے صدہا سال سے مشہور و معروف ہے۔

راگ داری سے واقف حضرات اس حقیقت سے باخبر اور آگاہ ہیں کہ راگ داری میں "ایک تال" اور "تین تال" کو اہم مقام حاصل ہے۔ یہ دونوں

پاکستان کے تاریخی خطے میں اُس وقت سے مروج ہیں جبکہ دہلی اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں راگ داری کا نام ونشان تک نہ تھا ایک اور "تال" جسے امیر خسرو کی ایجاد کا نام دیا گیا ہے اور جس کا کہ اب بھی پورے برصغیر میں نام "پشتو" ہے ایک تال" اور "تین تال" کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے یہ "پشتو" ہی ہے جسے پورے برصغیر کے تمام راگوں میں ایک اہم مقام حاصل ہے قوالی کیرتن اور موسیقی کے کئی اور اصناف اسی راگ کے ذریعے دل کش اور پر اثر بنتے ھیں اور اگر آپ تحقیق کریں تو آپکو معلوم ہوگا کہ پاکستان کے شمال مغربی خطہ اور بلوچستان کے صوبہ میں عوامی میلوں اور خانقاہوں میں "پشتو" تال صدہا سال سے مختلف شکلوں میں جلوہ افروز ہے خود اس راگ کا نام اس حقیقت کا مظہر ہے کہ یہ پاکستان کی موسیقی کے سرچشمے کی پیداوار ہے۔

یہی حال حضرت امیر خسرو کے نام سے منسوب "زلیف"، "زنگولہ"، اور "سوبلہ" کا ہے۔ بلوچستان اور سرحد میں صدہا برسوں سے رقص کی ایک صنف موجود ہے جس میں رقاص اپنے سر کے بالوں کو ایک خاص منظم اور پرکشش انداز میں حرکت دیتا ہے اسے زلفوں کے رقص کا نام دیا گیا ہے یہ وہی صنف ہے جس ھمارے پاکستان کے "لوڑیوں" نے بہرام گور کی جشن تاجپوشی میں مظاہرہ کیا تھا۔

"زنگولہ" رقص کا وہ انداز ہے جس میں رقاص اپنی پازیبوں کی حرکات سے کھیلتا ہے۔ پشتو زبان میں زنگولہ اس جرس کو کہتے ھیں جو پازیب میں بھی استعمال ہوتا ہے، باقی رہی "سوبلہ" کی بات ؟ تو یہ بھی ھمارے ہاں کے قدیم عوامی رقصوں کی ایک صنف ہے۔ اسے "سوبلہ" اور "سنگھار" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ رقص کے اس صنف کے مظاہرے کے دوران رقاص ہاتھوں سر، آنکھوں اور بازوؤں کی حرکات و سکنات کے ذریعے سنگھار کرنے کا تاثر

پیش کرتے ھیں۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ آپکو وہ رقص ضرور دیکھنا چاہیے جو عظیم نظریات سے منسوب اور حسین حرکات و سکنات کا مظہر ہے یہ پاکستان کے سرحدی باشندوں کا وہ رزمیہ رقص ہے جس میں جنسی جذبات کو مشتعل نہیں کرتا بلکہ لوگوں کو عسکریت کے جذبے کا پیغام دیتا ہے۔

اگر آپ "کیسا" کے تاریخی پہاڑ کے "کند" کے دامن میں کھڑے ہو کر "تور بیکئی" کا یہ تاریخی نعرہ نہیں کرا سے

جانان می سر پہ وطن کشئے شو
پہ تار د زلفو بہ کفن ورلہ گنڈمہ

تو آپکو محسوس ہوگا کہ پاکستان کے بلند و بالا کہساروں اور چٹیل میدانوں کے الاؤ میں کتنی گرمی، دلکشی عظمت اور جلال موجود ہے؟ آپکو ایسا کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس میں آپکی ملی مفادات کا راز مضمر ہے۔ لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم ایسا نہیں کرتے اب تک دہلی اور اس کا بادشاہی دربار، بلائے بے درمان کیطرح ھمارے بعض قلم کار بھائیوں کے ذہنوں پر سوار ہے اس دفن شدہ ماضی کے کھنڈرات کی بھول بھلیوں سے نکلنے میں ہی ھماری خیریت ہے ھمارے ماضی کا دہلی اب اسلام آباد میں منتقل ہو چکا ہے۔ وہ دہلی جسے ھمارے جیالے اباؤ اجداد نے عظمت جلال اور رعنائی عطار کی تھی اب رنگ بدل چکا ہے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جن فنون کا ہم دہلی کو سرچشمہ تصور کرتے ھیں اس کا مرکز آپکے اپنے ہی وطن پاکستان میں ہے یہ کتنا ظلم ہے کہ اب بھی ھمارے بعض ہم وطن دہلی ہی کو اپنے ناپختہ حوالوں کے ذریعے ھماری پرانی اور نئی ثقافت کا سرچشمہ بتاتے ھیں اور انہی لاوارث کتابی حوالوں کے ذریعے اپنے آپ اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں مصروف ھیں جو دہلی دربار کے ازلی کاسہ لیسوں نے اسکی مرکزیت کے جواز کی کوشش میں تحریر کی تھیں حالانکہ روشن تاریخی حقائق

کا زیور بنائیں، تو پھر ہندوستان والوں کے پاس کیا کچھ باقی رہے گا؟ آج اگر ہندوستان "ہیرا بائی بڑودکار" پر فخر کرتا ہے تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ خاتون استاد عبدالکریم خان کی صاحب زادی اور شاگرد نہیں تھیں؟ اور استاد امیر خان جیسے ہندوستان کی حکومت نے "بدھا بھوشن" کا اعزاز دیا تھا کون اور انکے آبا و اجداد کس خطے سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے تھے؟

یہ قدیم اور جدید پاکستان کے رقاص ہی تھے اور ہیں جو شعر بنکر آپ کو بتا سکتے تھے، اور بتا سکتے ہیں کہ حقیقی رقص ہے کیا؟ اسکے کیا معنی ہیں؟ اسکی سماجی اہمیت کیا ہے؟ اور ماحول پر اسکا اثر کیا پڑتا ہے؟ یہ ایک سخت کوشش وطن دوست، قوم پرور اور جنگ جو قوم کا ایک ایسا فن ہے جو بزم میں لرزم کا سماں پیدا کر کے اپنے عوام کو حفظِ بدن اور حفظ وطن کا گر سکھاتا ہے۔

لیکن ہماری اپنی غفلت عیش پرستی اور جنسی بے راہ روی کے باعث "ٹوسٹ" "راک اینڈ رول" "جرک" اور ہم جو دیگر خرافات میں تحلیل ہو رہا ہے۔ اور ان خرافات کے پرچارک ماضی کے رقص کو "صدیوں پرانے زخم" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور پھر دلیل بازی بھی کرتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہی ہے، کہ آج نسلِ نو گھر دن کلبوں اور ہوٹلوں میں جن جنسی دھنوں پر رقص کرتی ہے۔ اگر اسے دوبارہ پاکستان کے اپنے ہی علاقائی رقصوں کی طرف راغب کیا جائے تو کیا اس سے ہماری ملی تشخص کو عظمت جلال اور رعنائی حاصل نہیں ہوگی؟ اور کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس انسانی جبلت کو ہم جنسی جذبے کے اشتعال کی بجائے قومی کردار کی عظمت کی تعمیر کا ذریعہ بنائیں۔

نام تو ہم خسرو، اقبال، رحمان شاہ لطیف، بھلے شاہ اور جام درک کا لیتے ہیں اور یہ عمل؟ آپ خود آگاہ ہیں!

عیان راچہ بیان

په شعر کې د فکر یو والئ

نذیر هنروال

درنو او محترمو میلمنو او ملګرو!

د ننۍ په دې غونډه کې چه موضوعات یې سراسر ادبي او تحقیقي دي زما دپاره څه وئیل ډیره ګرانه خبره ده. هغه په دې چه زه تر اوسه پورې لا په دې لارکې دیوه زده کوونکي حیثیت لرم او بیا زد کړه هم د څه محدود علم نه. بلکه د پښتو ــ د هغې فصیح او بلیغې ژبې چه په باره کې یې حنان بارکزئ وائي ــ

زه پښتون لا په پښتو ژبه کې اړ سم
ترو ماته به ترکې خبرې غوکړې

مطلب مې دا دئ چه زه چه دا وخت له دې ستیج څخه تاسې ته مخاطب یم. نو د دې دپاره نه چه ستاسې په مخ کې به د ګرانې پښتو په باب څه علمي یا تحقیقي مقاله وړاندې کم. او باميد چې تاسې هم له ما څخه د دې توقع ونه کړئ ولې چه دا د پوهانو او مشرانو کار دئ. او زه نه ځان پوه ګڼم نه مشر. بلکه ما په سر کې لا وویل چه زه تر اوسه پورې لا د زد کړې په مراحلو کې یم. بهر حال.

ما چه دیوه زده کوونکي په حیثیت تر اوسه پورې څه لوستي

یالیدلی دی دهغه په رڼاکی دیوے کوچنئ نکتے په باب څه ویل غواړم که ستاسی اجازه وی۔

ماچه ترا وسه پورې څه لوستی یالیدلی دی۔ له هغه څخه دے نتیجے ته رسیدلئ یم۔ چه پښتو یوه ژبه ده۔ چه د نړئ د ډیرو ژبو سره وړه په وړه مخ په وړاندی یون کوی۔ خوله دے سره سره د غه ژبه یعنی پښتو د نورو ژبو په مقابل کی ځان له یو امتیاز هم لری۔ داسی امتیاز چه د نړئ، نوری ټولی ژبی ځنی بے برخی دی۔ هغه امتیاز دادئ چه پښتو د نورو ژبو په شان یوازی داظهار وسیله نه ده بلکه دا د خپلو ویونکو د پاره د یوه دستور او آئین حیثیت لری ــــ دستور او آئین لا څه، چه په ځینی معاملاتو کی خو مذهب او دین مقام ته رسیږی۔ مثلاً په پښتو کی وعده خلافئ دروغو، بے همتئ، ظلم، غلا او داسی نورو ناوړه کارونو ته دکرکی په نظر کتل کیږی۔ او هر کله چه په یوه پښتانه کی له ذکر سوو شیانو څخه یو هم څرګند سی۔ هغه پښتون نه بلل کیږی۔ بلکه هغه ته په سپکه ستر ګه کتل کیږی۔ او هر وخت په داسی نامه بلل کیږی۔ چه هیڅ یو پښتون هم هغه نوم د ځان د پاره نه خوښوی۔ او خوښوی به ئے څنګه چه په دے چم نه یوازی پخپلو کی بلکه په اغیارو کی هم هغه لرسوائي سره مخامخ کیږی۔ ولی چه د نړئ د یوه میړنی او باهمته قام په حیث د خپل تاریخ په حواله موږ د نړئ په قامونو کی یو لوړ مقام لرو۔ همدغه وجه ده چه د نړئ نور قامونه موږ هر وخت په نظر کی ساتی هغه زموږ د پښتون ولئ اعتراف کوی خو هر کله چه

هغه په موږ کې یوه نیمګړتیا ووینی. داسې نیمګړتیا چې موږ د پښتون ولۍ له مقام څخه راټیټوي. نو هغه زموږ د صفاتو په ترڅ کې د هغه نیمګړتیاوو ذکر هم کوي مثلاً د غرب ډیرو ختیځ پوهانو د ادب په حوګړکې د پښتو او پښتنو مقام منلئ دئ. او د اعتراف په توګه یې د پښتو ادب په باب ډیرې خبرې کړې، پښتو او پښتانه یې ستائلي دي. خو له دې سره سره یې زموږ ځینې عیبونه هم په ګوته کړي دي.

مثلاً د فرانسس ناماتو ختیځ پوه جیمز ډارمسټټر په خپل اثر " د پښتو نخوا د شعر هار او بهار "کې د ډیرو قصیدو او صفتو په ترڅ کې یو ځای کاږ ي.

"ټول پښتانه شاعران تقوی نه لري. ځینې داسې شاعران ستر چه هغه د نورو شاعرانو شعرونه په خپل نامه وائي. یعنې په مقطع کې خپل نوم وراچوي. په دغه ادبي غلاکې یوه سړی چه شامک نومیږي دومره شهرت موندلئ دئ چه اوس یې نوم د متل حیثیت پیدا کړئ دئ. ځکه پښتانه و هر ادبي غله ته دکنائي په ډول وائي. " بس یې که شامکه، په آخر دی و وهله؛ یعنې بس یې که په آخر کې معلوم سوے، چه دبل و غزل ته دی په مقطع کې خپل نوم وراچولئ دئ.

د جیمز ډارمسټټر له دے وینا څخه داخرګند یږي چه پښتانه له غلاء په تیره بیا له ادبي غلا څخه ډیر بد وړي. او بیا د ډارمسټټر وینا لا څخه دا خبره څرګنده شوه هر یو ته د پښتانه په حیث ډیره ښه معلومه ده چه موږ نه یوازې له ادبي غلا څخه، بلکه له هرې غلا څخه څومره کرکه کوو څو په دے لړکې زه دومره و نیل غواړم. چه د

یہ ہے کہ یہ علم و عرفان کا دور ہے۔ انسانوں کے ذہنوں کے دریچے کھل چکے ہیں اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ تاریخ کے معلومہ اور غیر معلومہ ادوار سے حقائق کا کھوج لگائیں آج کے انسان کو لاوارث تاریخی حوالوں سے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا البتہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خدا کی دی ہوئی آنکھوں اور شعور سے نئی نسل نے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ اس لئے یہ دجل و فریب میں نہیں پھنس سکتے اب ہم اس حقیقت کو مان گئے ہیں کہ دنیا میں ترقیاتی عمل کی رفتار کو کوئی نہیں بند کر سکتا ہے یہ ہوتا آیا ہے کہ کسی خام مال سے زیورات کسی سنگِ خارا سے اصنام اور تودہ گل سے کوئی یادگار عمارت تعمیر کی گئی ہے تہذیب کا یہ عمل صدیوں سے جاری ہے اور اسی طرح جاری رہے گا۔ چراغ سے چراغ جلنے کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ خود انسان یا اسکی دریافت۔ میں یہ مانتا ہوں کہ حضرت امیر خسرو نے یقیناً ہماری ثقافت تہذیب علم فن اور شعر کو سنوارا ہے اس سے اس کام میں خام مال اس کی تاریخی خطے سے ملا ہے جو آج پاکستان کے نام سے موسوم افسوس صرف اس بات پر ہے کہ ہمارے فضلاء اور علماء حقائق سے چشم پوشی کر کے غیر ملکی محققین کی خام دریافتوں پر، اور ناکام کوششوں پر سر دھن رہے ہیں۔ اور انہی کے چبائے ہوئے نوالوں کو چبائے جا رہے ہیں جنکا کہ مقصد یہ ہے کہ پاکستانی علاقوں کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کو اجاگر نہ ہونے دیا جائے اور یہاں کی ہر اچھائی ہر خوبی، ہر علامت اور یہاں کی ہر برتری کو دوسرے ملکوں، دوسرے علاقوں اور دوسری تہذیبوں کے نام سے منسوب کیا جائے۔

من از بیگانہ گان ھرگز نہ نالم
کہ با من ھر چہ کرد آن آشنا کرد

کے مصداق، افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ ہم برسوں درسِ خودی

وہ یہ بھی لکھ سکتا تھا کہ "کسے" فورٹ سنڈیمن کے قریب واقع ہے۔ لیکن اس نے جان بوجھ کر "کسے" کے دامن کے نہ تو فورٹ سنڈیمن کا نام لیا نہ لورالائی اور نہ لورالائی کے قریب تاریخی آتش کدہ "دہار" کا کسی نے کچھ نہیں کہا اور نہ کچھ لکھا۔ کیونکہ سب کے سب ایوب خان کی سیاسی مصروفیات میں مصروف تھے۔ ان دنوں میں "مانٹ گمری" سنٹرل جیل میں نظر بند تھا۔ میں نے مذکورہ مقالے کے جواب میں ایک طویل مضمون لکھا۔ بجائے اسکے کہ جیل کے حکام اس مضمون کو سرکاری رسالے کے نام روانہ کرتے، سی آئی ڈی کے افسروں کو دیا اور مضمون چھپ نہ سکا۔

بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پاکستان کے خطے نے اسلام سے پہلے جو تاریخ مرتب کی ہے اس سے قطع تعلق ایک قومی نقصان ہے اسے اگر ہم صرف نظر کریں گے تو یہ علم و عرفان کی ناقدری ہوگی اور اس کا ہماری قومی عظمت اور افتخار پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑے گا اور اگر اس کی طرف ہم توجہ دیں تو اس سے ہمارے مذہبی عقیدے اور نظریہ پاکستان کو مزید تقویت حاصل ہوگی ایران کی مثال ہمارے لیے کافی سبق آموز ہے ان کے پاس تقریباً گزشتہ ۲/۱ ۳ ہزار سال کی تاریخ موجود ہے وہ تاریخ جس میں یقیناً آپکو "کیسا" اور پاکستان کے دیگر خطوں کی تاریخی داستانیں موجود ملیں گے۔ ان سب کو یکجا کرنا، اور قوم کے سامنے لانا، از حد ضروری کام ہے۔ ایسا کرنے سے ہی ہم یہ ثابت کر سکیں گے کہ جونپور کے والی، سلطان حسین شرقی، عطا علی خان تان سین، استاد عنایت خان نعمت خان بلاس خان، استاد عبدالوحید خان، عبدالعزیز خان، عبدالکریم خان، بیارے خان بنے خان اور حدداسد خان جیسے کلاسیکی مشہور فنکاروں کے آباؤ اجداد کا تعلق، پاکستان کے تاریخی اور جلالی خطے سے تھا۔ ان نامور کلاسیکل موسیقاروں کو اگر آپ ہندی کلاسیکل موسیقی کی تاریخ سے نکال کر ان کی اپنی آبائی تاریخ

عامی غلا خو حد معلوم دئ چه له کومه ځایه شروع کیږی لاکن دادبی غلا تعین کول او د شامکیانو پیژندل خه گران کار دئ ولی چه په دے لړکی ځینی ملگری تر حده پوره حده اجازه ورکوی. او د غلا گمان نه پرکوی. لاکن ځینی ملگری نکرخو پرېږده دالفاظو ویو والی ته لاهم غلا وائی مثلاً په نزدے تیر و ورځو کی یوه بنا غلی دخپلی جوړی کړی دے کاکړی غاړی پر بنیاد چه

غواړی خیر له بور گئی
لاس کی کچکول دئ دسپوږمئ
خیر دحسن زماله بوری
وری سپوږمئ ترستورو پوری

پر یوه ستر او مشر شاعر تور لگولئ وو. چه هغه خپله غزل زماله دے کاکړئ لنډئ څخه غلا کړے ده. دغزلی مطلع خه داسی وه.

دبنائست د روېږه گره وی اکثر میاشت
دکچکول غونډی بنکاره داختر میاشت

لکه څنګه چه مخکی ما وویل چه زما حیثیت دیوه لوستونکی دئ، ځکه دا فیصله کول، چه دا ادبی غلا ده او که نه. زما دپاره ډیر گران کار دئ. البته یو څو مثالونه داسی ستر چه که چیری هغه پر دے پیمانه وتلل سی نو عام شاعران خو چه ځینی محترم بابا گان به لاهم دغلا په تور تورن سی. مثلاً دحمید بابا مشهوره غزل.

خط پر مخ د صنم راغئ
که سپوږمئ سوه په هاله کی

د علي خان په ديوان کې داسې مخې ته راځي.

خط په مخ د صنم را غئ
که مياشت ګيره سوه هاله کې

زما محترم مشرانو او ملګرو به يقيناً ليدلي وي چه د ذکر سوؤ بابا کانو په دے غزلو کې، له مطلع په چپه چه ده ير يو والئ پکښې ستّه نور هغوی شعرونه يوله بله بيخي بېل او د هر يوه د خپل فکر ترجمان دی. خير دا خو لا پرېږ دئ او س نه يو داسې مثال وړاندی کوم چه د هغو د ول د هيڅ پاره امکان نه لري.

د دے مثال په لړ کې بره نه و و ايم چه غني خان غني چه په معاصرو شاعرانو کې د فلسفي په نامه ياديږ ي او د هغو خپل مخصوص او بېل انداز، چه نه په کلاسيکه شاعرئ کې د چاله انداز سره سمون خوري نه په جديده شاعرئ کې خو د هغو مشهور نظم

خوب وينمه عالمه که يئ څوک را کړي معنا
پروت يم سرمي اينښئ د خپل يار په زنګانه

د نولسمې عيسوي صدئ ديوه عام او اولسي شاعر علي خان د غزلي له مطلع سره بيخي سمون خوري علي خان د غه خيال داسې څرګند کړئ دئ.

خوب وينمه عالمه که هر څوک را کئ معنا
سرمي دئ په غيږ کې د جانان په زنګانه

خو د اولسي او بنداري شاعر علي خان او فلسفي شاعر غني خان په کلام کې له د ے لمه يو دوو مصرعو پرته نور هيڅ يو والئ او اشتراک نسته. او يقيناً چه هيڅوک به د ے منلو ته تيار نه سي، چه غني خان دا

خیال له علي خان ښخه اخستې دې. که په دې لړکې په خپله علي خان بېرته راڅرګند ئ سي او دعوئ وکړي چه غني خان دا خیال له ما ښخه اخستې دې. نو دا خو امکان لري، چه ښېښتا نه دا او اګون قائل سي، او وائي. چه غني خان دا نظم په تیر جنم کې وئیلئ وو. او علي خان ځنې غلا کړې دې. لاکن دا بې هیڅوک و نه مني چه غني خان دا خیال له علي خان ښخه اخستې دې.

بهرحال دد دې ټولو خبرو مقصد می دا وو چه نن چه موږ یو په بل د غلا کوم تورونه لګوو باید په دې کې ډېر پام وکړو ولې چه دا زموږ د بیلتون او د پښتو د تاوان سوب جوړیږي. او د پښتو تاوان زموږ د ټولو تاوان دې. او موږ ټول دا دعوئ لرو چه د پښتو د ګټې په خاطر کار کوو. که موږ په دې دعوئ کې رښتیني یو نو باید چه موږ له هر هغه کار ښخه ډډه وکړو. کوم چه د ګرانې پښتو د خدمت او چوپړ په کار کې زموږ تر منځ بیلتون او کرکه پیدا کوي. کني نو عجبه نه ده چه د ډېر قریبي تعلق باوجود به زموږ زړونه یو له بله ډېر لیري وي. بالکل دا سې لکه چې وائي.

یار می د ځوړ وکړوسنده دې
زه د ریښمو کلاوه په اره سومه

(والسلام)